اکتوبر ۲۰۰۶ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

عرض احوال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پوپ کے بیان کا اصل جواب؟

پوپ بنی ڈکٹ کی اسلام اور جہاد کے خلاف ہرزہ سرائی یا تو اسلامی تاریخ اور تورات و انجیل کی تعلیمات سے ناواقفیت کے باعث ہے یا پھر مسلمانوں کے خلاف بدترین تعصب کا مظہر ہے۔ پوپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ انجیل و تورات میں زمین پر خدائی حکومت کے قیام کا ذکر ہے جو طاغوتی قوتوں کے خلاف جہاد کے نتیجے میں ہی قائم ہوسکتی ہے۔ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی حکومت بھی جہاد کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی اور اس کا تفصیلی ذکر نہ صرف قرآن مجید میں بلکہ اُس تورات میں بھی موجود ہے جو عہد نامہ قدیم کے نام سے آج بھی بائبل کا مستقل حصہ ہے۔ اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے انبیاء و رسل کی پوری تاریخ جہاد کے واقعات سے مزین ہے۔ لہٰذا قرآن اور دیگر سابقہ آسمانی صحائف کی رُو سے جہاد اللہ سے وفاداری کی شرطِ لازم اور خدائی مقاصد کے عین مطابق ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ اللہ کی حکومت کے قیام کے نتیجے میں مثالی امن و امان اور عدل و انصاف کا نظام قائم ہوتا ہے اور انسانی حقوق کی اعلیٰ پیمانے پر پاسداری ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر ایرانی سپہ سالار سے مخاطب ہوکر فرمایا تھا کہ ''ہم ایک اہم مشن (یعنی نبویؐ مشن) پر بھیجے گئے ہیں تاکہ لوگوں کو کفر و شرک کے اندھیاروں سے نکال کر اسلام کے نور سے روشناس کرائیں اور انسانیت کو بادشاہوں کے ظلم و ستم سے نجات دلا کر اسلام کے کامل عادلانہ و منصفانہ نظام سے متعارف کرائیں''۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دنیا کو اسلام کے عادلانہ نظامِ اجتماعی کی برکات سے بہرہ مند کرنے کے لیے جہاد کیا' نوع انسانی کو بادشاہوں کے ظلم و ستم سے نجات دلا کر خدائی حکومت قائم کی اور امن و امان اور عدل و انصاف کا ایک مثالی نظام قائم کر کے دکھایا۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پوری دنیا میں کسی ایک فرد کو بھی بزورِ شمشیر مسلمان نہیں کیا گیا۔ لوگ اسلام کی عظمت' دینِ حق کی برکات اور مسلمانوں کے کردار سے متاثر ہوکر خود دین اسلام میں داخل ہوئے۔ پوپ کو یہ زہر اُگلنے کی جرأت اس لیے ہوئی کہ ہم نے خود اسلام کے روشن

E:\Meesaaq_2006\Ms_2006\meesaq october\arz-sep.inp 8/21/2014 9:32 AM PAGE 1 (1,1)

چہرے کو داغدار کر دیا ہے۔ آج پوری دنیا میں کہیں اسلامی حکومت قائم نہیں اور نہ ہی مسلمان عظمتِ کردار کے حامل ہیں۔ ہمارا حال تو بقول اقبال یہ ہے کہ :

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدّن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

ہماری کمزوری کی وجہ ہمارے یہی اجتماعی جرائم ہیں۔ اسی جرم ضعیفی کی سزا ہے کہ حکومتی ترجمان کہہ رہے ہیں کہ حدود آرڈیننس کا معاملہ امریکہ کے دباؤ پر نہیں اٹھایا گیا' جبکہ امریکہ کا کہنا ہے کہ یہ ہمارے دباؤ ہی کا نتیجہ ہے۔ اس سے زیادہ ذلت و رسوائی کی صورت کیا ہوگی کہ صدر مشرف راگ الاپ رہے ہیں کہ امریکی فوج کو پاکستان میں کارروائی کی اجازت نہیں دیں گے' جبکہ امریکہ دھڑلے سے کہہ رہا ہے کہ وہ ایسا موقع آنے پر کارروائی ضرور کرے گا۔

سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ملی و قومی جرائم کے نتیجے میں جو ذلت و رسوائی آج ہمارا مقدر بنی ہوئی ہے' پوپ کا بیان اسی ذلت کا ایک مظہر ہے۔ وگرنہ اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ وحشی اور دہشت گرد کون ہے اور نائن الیون کا ڈرامہ کس نے رچایا تھا۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تاریخ کی یہ عظیم ترین سازش امریکہ اور یہود کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔ پوپ کے بیان پر امت مسلمہ کا بھرپور احتجاج بالکل صحیح ہے' لیکن صرف احتجاجی مظاہرے پوپ کی ہذیان گوئی کا اصل جواب نہیں۔ اس کا اصل جواب یہ ہوگا کہ ہم پاکستان میں دین حق یعنی خدائی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کریں تاکہ دنیا خدائی حکومت کی برکات کا بچشم سر مشاہدہ کر سکے اور پوپ کی کذب بیانی اور اسلام سے عدم واقفیت پوری دنیا پر آشکارا ہو جائے۔ تاہم اس کے لیے محنت' کوشش اور بھرپور جدوجہد کرنا ہوگی اور ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ اس لیے کہ دین حق کا اولین غلبہ بھی نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کی بھرپور جدوجہد اور قربانیوں کے نتیجہ میں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ OO

تذکرہ و تبصرہ

قربِ الٰہی کے دو مراتب

اور ہماری دینی ذمہ داریاں

قرآن و سنت کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ نے یہ خطاب یکم مئی ۱۹۸۱ء کو قرآن اکیڈمی لاہور میں تنظیم اسلامی پاکستان کے چھٹے سالانہ اجتماع کی پہلی نشست سے فرمایا تھا۔ اس خطاب کو شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم نے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے مرتب کیا تھا۔ یہ اہم خطاب مزید ایڈیٹنگ اور نظر ثانی کے بعد ہدیۂ قارئین ہے۔ (خالد محمود خضر)

خطبۂ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات:

اعوذ باللّٰہ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجیم۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ۚ وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا ۚ وَکُنۡتُمۡ عَلٰی شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَکُمۡ مِّنۡهَا ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمۡ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّکُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّةٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ وَیَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾﴾ (آل عمران)

’’اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے اور دیکھنا تمہیں ہرگز موت نہ آنے پائے مگر اس حال میں کہ تم (اللہ کے) فرماں

بردار ہو۔ اور چمٹ جاؤ اللہ کی رسّی کے ساتھ مجموعی طور پر اور باہم تفرقہ میں مت پڑو۔ اور یاد کرو اللہ کی اُس نعمت کو جو تم پر ہوئی' جبکہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم تو آگ کے گڑھے کے بالکل کنارے تک جا پہنچے تھے مگر اللہ نے تمہیں اس سے بچایا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پا سکو! اور چاہیے کہ تم سے ایک ایسی جماعت وجود میں آئے جو خیر کی دعوت دے' نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے ـــــ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''۔

سورۂ آل عمران کی ان آیات میں ہم مسلمانوں کے لیے ایک لائحہ عمل ہے۔ اگرچہ قرآن مجید کی ہر آیت میں علمی نکات بھی ہیں' حکمت وفلسفہ کے مسائل بھی ہیں اور عملی رہنمائی بھی ہے' چنانچہ ان میں بھی یقیناً علمی اعتبار سے بڑے وقیع نکات موجود ہیں' لیکن آج میری گفتگو ان کے عملی پہلوؤں کے مختصر بیان تک محدود رہے گی۔ اس لیے کہ علمی نکات پر توجہ کا ارتکاز زیادہ ہو جائے تو اکثر و بیشتر عملی رہنمائی کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔

قرآن مجید کی یہ تین آیات اس عملی رہنمائی اور ہدایت کے اعتبار سے جو وہ اہلِ ایمان کے سامنے رکھتا ہے' قرآن حکیم کے جامع ترین مقامات میں سے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ایک مسلمان کے کیا فرائض ہیں اور اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں' اسے سب سے پہلے کن امور پر اپنی توجہات کو مرتکز کرنا ہوگا' ان کو بڑی جامعیت کے ساتھ پہلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسری آیت کا موضوع یہ ہے کہ ان افراد کو باہم جوڑنے والی چیز' انہیں ایک اُمت بنانے والی شے' انہیں ''حزب اللہ'' بنانے والی چیز' ان کے مابین ذہنی وفکری ہم آہنگی اور عملی اتحاد پیدا کرنے والی چیز کون سی ہے!! ـــــ اور تیسری آیت میں یہ نشاندہی فرمائی گئی ہے کہ اس اُمت یا حزب اللہ یا اس جماعت کا مقصد کیا ہے! کس کام کے لیے اس کو محنت اور جدّ وجہد کرنی ہے!

ان آیات پر مزید گفتگو سے قبل میں آپ کے سامنے چند احادیث نبویہؐ پیش کر رہا ہوں۔

عَنْ عِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ صَلّٰى لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الْفَجْرِ ثُمَّ وَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ، فَقَالَ قَائِلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَاَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا، قَالَ : ((اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ كَانَ عَبْدًا حَبْشِيًّا، فَاِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ، عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ ، وَاِيَّاكُمْ وَالْمُحْدَثَاتِ فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ))(۱)

پہلے ہم اس حدیث کا ایک رواں ترجمہ کر لیتے ہیں:

''حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور اس کے بعد ہمیں ایسا پُر اثر وعظ فرمایا کہ ہماری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور ہمارے دل اس سے لرز گئے۔ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! یہ تو ایسے لگتا ہے کہ آپؐ نے کوئی الوداعی وعظ فرمایا ہے (یعنی اس انداز سے جیسے آپؐ ہم سے وداع ہو رہے ہیں یا ہمیں وداع کر رہے ہیں) تو ہمیں نصیحت کیجیے! آپ ﷺ نے فرمایا: ''(سب سے پہلے تو) میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ کے تقویٰ کی، وہ جو العزیز ہے اور بہت جلالتِ شان والا ہے، اور (دوسری نصیحت ہے) سننے اور ماننے کی (یعنی اجتماعی نظم و ضبط) اگرچہ ایک حبشی غلام تمہارا امیر بنا دیا جائے۔ اس لیے کہ جو کوئی تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ پس تمہارے لیے میری سنت اور ہدایت یافتہ راست رَو خلفاء کی سنت کی پیروی

(۱) سنن الترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع۔ وسنن ابن ماجه، المقدمة، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين۔ وسنن الدارمی، المقدمة، باب اتباع السنة۔ الفاظ کم وبیش سنن دارمی کے ہیں۔ وسنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة۔

لازم ہے۔ اسے اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑے رہنا۔ (یہ محاورہ ہے' یعنی کسی چیز کو شدت اور مضبوطی کے ساتھ پکڑ لینا) اور دیکھنا (دین میں) نئی نئی باتیں ایجاد کرنے سے بچتے رہنا' اس لیے کہ ہر نئی بات بدعت ہے' اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ سنت کیا ہے' اتباعِ سنت کا مقام کیا ہے اور احیائے سنت کا مرتبہ کیا ہے! وہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ہمیں نمازِ فجر کے بعد وعظ و نصیحت فرمائی اور یہ ایسی نصیحت تھی کہ اس سے حاضرین کے قلوب پر رقت طاری ہوگئی' وہ لرز کر رہ گئے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! یہ تو ہمیں ایسے لگ رہا ہے جیسے آپؐ نے الوداعی نصیحت فرمائی ہو۔ کہیں آپؐ ہم سے رخصت تو نہیں ہو رہے؟ اور اگر یہ اسی نوعیت کی کچھ بات ہے تو ہمیں مزید وصیت فرمائیے کہ ہم آپؐ کے بعد کیا کریں؟ اگر آپؐ کے رخصت ہونے کا وقت ہے تو آپؐ کے بعد ہمارا سہارا کون ہوگا؟ اس پر آپؐ نے فرمایا: ((اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ)) ''میں تمہیں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں جو غالب ہے اور نہایت جلالت شان والا ہے''۔ دیکھئے ہم نے سورۂ آل عمران کی جو تین آیات پڑھیں ان میں سے پہلی آیت میں بھی تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ہے :

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾

نبی اکرم ﷺ نے پہلی وصیت اللہ کے تقویٰ کی فرمائی۔ بعدہٗ فرمایا: ((وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ)) ''اور میں تمہیں وصیت کرتا ہوں سمع و طاعت کی'' یعنی سننے اور ماننے کی۔ نظم کی پابندی ہو' افتراق اور تفرقہ نہ ہو۔ سورۂ آل عمران کی دوسری آیت میں تفرقے سے بچنے کی تاکید ان الفاظ میں کی گئی ہے : ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ ''اور مجموعی طور پر اللہ کی رسّی (قرآن حکیم) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور باہم تفرقہ میں مت پڑو!'' قرآن اور حدیث میں کوئی فرق اور بُعد نہیں ہے۔ حدیث

دراصل قرآن کی تبیین وتفہیم ہے۔ الفاظ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ہیں جبکہ مفہوم کُل کا کُل قرآن حکیم کا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے سمع وطاعت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ((وَاِنْ کَانَ عَبْدًا حَبْشِیًّا)) ''خواہ تمہارا امیر ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو'' پھر بھی تمہیں سمع و طاعت پر کاربند رہنا ہوگا۔ یعنی کسی غلام کا امیر وحاکم بننا تمہارے نفس پر بڑا شاق گزر سکتا ہے اور تمہارے لیے کٹھن امتحان بن سکتا ہے کہ ہم آزاد ہیں اور یہ غلام یا غلام زادہ ہم پر امیر کیسے ہوگیا؟ نبی اکرم ﷺ نے ۸ھ میں ایک لشکر کا امیر اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو بنایا اور حیاتِ طیبہ کے آخری ایام میں روم کی سرحدوں کی جانب بھیجے جانے والے جیش کا امیر حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو بنایا جن کی ماتحتی میں حضراتِ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر اصحاب بھی تھے۔ اس پر قریش کے بعض حضرات نے دبی زبان سے ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ اسی سے قیاس کر لیجیے' عربوں کا ذہن یہ تھا کہ اگر غلام آزاد بھی ہو جائے تو اس کو وہ اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے' بلکہ وہ ''مولیٰ'' شمار ہوتا تھا۔ یعنی اس کے لیے غلامی اور آزادی کے درمیان کا کوئی مقام ان کے ذہن میں ہوتا تھا۔

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((فَاِنَّـهٗ مَنْ یَعِشْ مِنْکُمْ بَعْدِیْ فَسَیَرَی اخْتِلَافًا کَثِیْرًا)) ''پس تم میں سے جو کوئی بھی میرے بعد زندہ رہا وہ جلد ہی کثیر اختلافات دیکھے گا''۔ اُن اختلافات کے زمانے میں تمہارے لیے مشعل راہ کون سی ہے! تمہارے لیے روشنی کا مینار کون سا ہے! فرمایا: ((فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ)) یہاں کلمہ ''فا'' بہت معنی خیز ہے۔ یہ ان اختلافات کے لیے جائے پناہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے کہ جائے پناہ صرف یہ ہے کہ: ''پس تم پر لازم ہے میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھامنا''۔ کیونکہ خلفائے راشدین المہدیّین کی سنت نبی اکرم ﷺ کی سنت ہی کا تتمہ ہے۔ یہاں نبی اکرم ﷺ نے اپنی سنت کے ساتھ خلفاء الراشدین المہدیّین کی سنت کو بھی ملحق فرمایا ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمارے لیے نجومِ ہدایت ہیں' تاہم انفرادی

(individual) طور پر ع ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' کے مصداق کسی میں زہد کا رنگ غالب ہے' کسی میں مجاہدے کا رنگ غالب ہے' کسی کو انفاق سے زیادہ اُنس ہے' کوئی نمازیں زیادہ پڑھنے سے مناسبت رکھتا ہے' لیکن جماعتی حیثیت سے سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام متشکل ہو کر سامنے آتی ہے خلفائے راشدین میں۔ اس لیے کہ یہ وہ دَور تھا کہ پوری اُمتِ محمدیہؐ ایک وحدت تھی' کوئی افتراق نہیں تھا۔ دینی اور مذہبی قیادت بھی خلفائے راشدین المہدیّین کے ہاتھ میں تھی اور سیاسی قیادت وحکمرانی بھی ان ہی کے ہاتھ میں تھی۔ پوری اسلامی مملکت ایک ہی تھی' مسلمانوں کی علیحدہ علیحدہ مملکتیں نہیں تھیں۔ ایک ہی نظام پوری مملکت اسلامیہ میں جاری و نافذ تھا۔ لہٰذا اُس وقت جو فیصلے ہوئے' یعنی خلفائے راشدین کے اجتہادات کو اگر اُمت نے تسلیم کر لیا تو ان کے اجماع ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ ان فیصلوں کی حیثیت محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی مجمع علیہ سنت کی ہوگی۔ میرے نزدیک ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) کی یہ احسن اور صحیح تعبیر ہے۔ مزید برآں خلافت راشدہ نبوت کا تتمہ وتکملہ ہے۔ اسی لیے اس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا جاتا ہے۔

آگے نبی اکرم ﷺ امر کے صیغے میں حکم دے رہے ہیں کہ: ((عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ)) ''اسے اپنے دانتوں کی کچلیوں سے مضبوطی سے پکڑ کر رکھو''۔ معلوم ہوا کہ یہ آسان کام نہیں ہے' بڑے دباؤ آئیں گے' حالات کا رُخ کچھ اور ہوگا۔ ان میں سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور سنت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو بڑی مضبوطی سے تھامنا ہوگا۔ آگے فرمایا: ((وَاِيَّاكُمْ وَالْمُحْدَثَاتِ فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) ''اور دیکھنا نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے سے بچنا' کیونکہ دین میں جو نئی چیز ایجاد کی جائے گی وہ بدعت ہوگی اور ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے''۔

سنت کا ہمہ گیر تصور

ابھی ہم نے جس حدیث کے مفاہیم ومعانی اور مطالب کو سمجھا ہے اس میں تو نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے بطور وصیت چند ہدایات ارشاد فرمائیں۔ اب میں ایک

دوسری حدیث پیش کر رہا ہوں جو ایک اصول کے اعتبار سے دُور کے زمانے سے متعلق ہے‘ یعنی جب وہ دَور آئے کہ اُمت میں فساد رونما ہو چکا ہو‘ بدعات کے ہجوم میں سنت گم ہوگئی ہو‘ اُس وقت مسلمان کیا رویہ اختیار کریں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ تو وہ تھا کہ جس میں سنت ایک خورشید تاباں کے مانند نصف النہار پر چمک رہی تھی‘ لیکن ایک دَور ایسا بھی آ سکتا ہے کہ سنت بدعات میں گم ہو جائے‘ بدعات کا اتنا انبار ہو کہ اس میں تلاش کرنا مشکل ہو جائے کہ سنت کیا ہے؟ اس دَور کے متعلق ایک حدیث بیان کی جاتی ہے جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں:

((مَنْ تَمَسَّکَ بِسُنَّتِیْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِیْ فَلَهٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِیْدٍ))(۱)

’’جب میری اُمت میں فسادِ عمومی ظاہر ہو چکا ہو‘ اُس وقت جو شخص میری سنت کو مضبوطی سے تھامے رہے گا تو اس کے لیے سو شہیدوں کا اجر ہے۔‘‘

اب ان دونوں حدیثوں کو سامنے رکھیے اور بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ سنت کا لفظ ہمارے ہاں ایک فقہی اصطلاح کے طور پر بھی آتا ہے۔ فقہی تقسیم اس طرح ہے کہ تعبدی اُمور میں فلاں کام فرائض ہیں‘ فلاں سنت ہیں‘ فلاں کام نوافل اور فلاں کام مستحبات ہیں۔ پھر سنن کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ یہ سنت مؤکدہ ہے اور یہ غیر مؤکدہ۔ اسی طرح چند معاشرتی و تمدنی آداب کو سنت قرار دیا جاتا ہے اور جب بھی لفظ ’’سنت‘‘ بولا جاتا ہے تو یہی تصور سامنے آ جاتا ہے۔ یہ بالکل دوسری تقسیم ہے۔ اس قسم کی جزوی سنتوں کا جب ذکر ہوتا ہے تو احادیث کا اندازِ بیان عموماً یہ ہوتا ہے کہ انہیں ’’مِنْ سُنَّتِیْ‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسے: ((اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ))(۲) ’’نکاح میری سنت میں سے ہے‘‘۔ اور: ((اَرْبَعٌ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِیْنَ : اَلتَّعَطُّرُ وَالنِّکَاحُ وَالسِّوَاکُ وَالْحَیَاءُ))(۳) ’’چار چیزیں انبیاء و رُسل (علیہم السلام) کی سنتوں میں سے ہیں: عطر لگانا‘ نکاح کرنا‘ مسواک کرنا اور حیا اختیار کرنا‘‘۔ جبکہ لفظ ’’سنت‘‘ ایک اصطلاحِ دینی‘ ایک

(۱) میزان الاعتدال للذهبی ۱/۵۱۹۔ والکامل لابن عدی ۳/۱۷٤

(۲) سنن ابن ماجه‘ کتاب النکاح‘ باب ما جاء فی فضل النکاح۔

(۳) مسند احمد۔

وحدت اور مجموعی اعتبار سے بولا جائے گا تو اس کا مفہوم ہوگا نبی اکرم ﷺ کا طریقہ‘ آپؐ کا طرزِ عمل‘ بحیثیت مجموعی زندگی کے معمولات میں نبی اکرم ﷺ کا قائم کردہ توازن۔ یعنی وہ نسبت و تناسب جو آنحضرت ﷺ نے معمولاتِ زندگی کے مابین برقرار رکھا۔

نبی اکرم ﷺ کی سنتِ جلیلہ کے دو اَجزاء

نبی اکرم ﷺ کی آغازِ وحی سے الرفیق الاعلیٰ کی طرف مراجعت تک کُل کی کُل حیاتِ طیبہ کو بحیثیت مجموعی (as a whole) لیجیے‘ تو یہ ہے سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ اجزاء کا معاملہ‘ اُن کی اہمیت اور ان پر اجر و ثواب اپنی جگہ ہے‘ کون مسلمان ہوگا جو اس سے انکار کی جرأت کر سکے؟ جس چیز کے متعلق بھی معلوم ہو جائے کہ نبی اکرم ﷺ کا طریقہ یہ تھا‘ اس کو اختیار کرنا یقیناً بہت بڑے اجر و ثواب کا موجب ہوگا۔ لیکن یہ سو شہیدوں کے مساوی ثواب کی جو بشارت دی گئی ہے‘ اس کے بارے میں جان لیجیے کہ ان جزوی باتوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ بشارت نبی اکرم ﷺ کے پورے طریقے کو مضبوطی سے تھامنے سے متعلق ہے۔ اس اعتبار سے فرض بھی سنت کا جزو بن جائے گا۔ فرض ویسے تو سنت سے بالاتر ہے‘ لیکن جب آپ اس پہلو سے دیکھیں گے کہ نبی اکرم ﷺ کا طریقہ بحیثیت مجموعی کیا ہے‘ تو اس میں فرائض بھی شامل ہیں‘ اس میں نوافل بھی ہیں‘ اس میں آپؐ کے معمولات بھی ہیں‘ شب و روز کے انداز بھی ہیں‘ جلوت بھی ہے‘ خلوت بھی ہے‘ آپؐ کے شمائل بھی ہیں۔ یہ سب مل کر جب ایک وحدت بنیں گے تو اس کا نام ہوگا ’’سنّتِ رسول‘‘ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ اس میں فرائض بھی آ گئے اور نوافل بھی آ گئے۔ غرضیکہ سب کچھ آ گیا۔ یہ ہے جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ۔ اسی کا دوسرا نام ہے اُسوہ یعنی نمونہ۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

’’(اے مسلمانو!) رسول اللہ (ﷺ) کی پوری زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے‘‘۔

اس ضمن میں یہ بات میں نے متعدد بار عرض کی ہے کہ اس سنت کو آپ ہمیشہ دو

حصوں میں منقسم سمجھئے۔ نبی اکرم ﷺ کی سنت یعنی آپؐ کے طریقے کا سب سے پہلا اور اہم جزو ہے ''عبدیت'' —— یہ عبدیت آپؐ کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ زندگی کے ہر گوشے میں سب سے غالب عنصر عبدیت کا ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں کھانا غلاموں کی طرح بیٹھ کر کھاتا ہوں۔ آپؐ کی پوری حیاتِ طیبہ پر اوّلین اور نمایاں ترین چھاپ اسی عبدیت کی ہے۔ آپ ﷺ عبدیتِ کاملہ کے مظہر اتم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عبدیت اُس برف کے تودے (iceberg) کے مانند ہے کہ جس کا بہت بڑا حصہ پانی میں چھپا ہوتا ہے' بس تھوڑا سا حصہ (tip) نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ رات کی تاریکیوں اور تنہائیوں میں ''عبداللہ'' اپنے ربّ کے حضور میں کھڑا ہوتا تھا (ﷺ) وہ بات ہی کچھ اور تھی۔ اس عبدیت کی وہ کیفیات بھی ہیں کہ: ((اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ))(۱) ''میں تو اس حال میں رات بسر کرتا ہوں کہ میرا ربّ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے''۔ یہ معاملہ کہاں ہمارے فہم میں اور ہماری سمجھ میں آئے گا! ایک عظیم ماثور دعا ہے جس میں نبی اکرم ﷺ پہلے اپنی زبانِ مبارک سے اپنی عبدیت کا اظہار فرماتے ہیں' پھر قرآن مجید کا ''شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ'' ہونے کا جو وصف ہے اس کے لیے دُعا فرماتے ہیں:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُکَ وَابْنُ عَبْدِکَ وَابْنُ اَمَتِکَ فِیْ قَبْضَتِکَ نَاصِیَتِیْ بِیَدِکَ مَاضٍ فِیَّ حُکْمُکَ عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُکَ اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اسْمٍ ھُوَ لَکَ سَمَّیْتَ بِہٖ نَفْسَکَ اَوْ عَلَّمْتَہٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِکَ اَوْ اَنْزَلْتَہٗ فِیْ کِتَابِکَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِہٖ فِیْ مَکْنُوْنِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجِلَاءَ حُزْنِیْ وَذَھَابَ ھَمِّیْ وَ غَمِّیْ))(۲) (آمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ)

''اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں۔ تیرے ناچیز غلام اور ادنیٰ کنیز کا بیٹا ہوں۔ مجھ پر تیرا ہی کامل اختیار ہے اور میری پیشانی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ نافذ ہے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب التنکیل لمن اکثر الوصال۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النھی عن الوصال فی الصوم۔

(۲) مسند احمد۔

میرے بارے میں تیرا ہر حکم اور عدل ہے میرے معاملے میں تیرا ہر فیصلہ۔ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں تیرے ہر اُس اسمِ پاک کے واسطے سے جس سے تو نے اپنی ذاتِ مقدس کو موسوم فرمایا' یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو تلقین فرمایا' یا اپنی کسی کتاب میں نازل فرمایا یا اُسے اپنے مخصوص خزانۂ غیب ہی میں محفوظ رکھا—— کہ تو بنا دے قرآن مجید کو میرے دل کی بہار' اور میرے سینے کا نور' اور میرے رنج وحزن کی جِلا اور میرے تفکرات اور غموں کے ازالے کا سبب''۔ (ایسا ہی ہوائے تمام جہانوں کے پروردگار!)

سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا جو دوسرا جزوِ اعظم ہے وہ کُل کا کُل ظاہر ہے' نمایاں ہے اور آنکھوں کے سامنے بالکل عیاں ہے۔ وہ ہے سنتِ دعوت' سنتِ تبلیغ' سنتِ انذار' سنتِ تبشیر' سنتِ شہادت علی الناس' سنتِ اظہار دین الحق علی الدین کُلِّہٖ' سنتِ تکبیر ربّ' سنتِ اعلائے کلمۃ اللہ' سنتِ ہجرت اور سنت جہاد وقتال۔

عظیم ترین اور متواتر سنت

اجرائے وحی اور یومِ بعثت سے لے کر اس حیاتِ دُنیوی کے آخری سانس تک نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی اسی سنت اور اسی طریق کے محور کے گرد گھوم رہی ہے۔ اس سے بڑی کسی سنت کا تصور ممکن نہیں۔ آنحضرت ﷺ کی سیرت وشخصیت کا نمایاں ترین پہلو جس زاویۂ نگاہ سے دیکھ لیجیے آپ کو یہی نظر آئے گا کہ دعوت ہے' تبلیغ ہے' تلقین ہے' حق کی طرف بلانا ہے' امر بالمعروف ہے' نہی عن المنکر ہے' دین حق کو سربلند کرنے کی سعی وجہد ہے۔ اس کے لیے تمسخر واستہزاء انگیز کیا جا رہا ہے' پتھروں کی بارش جھیلی جا رہی ہے' معاشی ومعاشرتی مقاطعہ برداشت کیا جا رہا ہے۔ اسی کے لیے مجاہدہ ہے' کشمکش ہے' تصادم ہے اور اسی کے لیے گھر بار کو چھوڑ اجا رہا ہے۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لیے ایک جماعت کو منظّم کیا جا رہا ہے اور جماعت سے وابستگان کا تزکیۂ نفس ہو رہا ہے۔ اسی کے لیے جہاد مع النفس اور قتال بالسیف ہے۔ اسی کے لیے نظروں کے سامنے عزیز ترین جاں نثاروں کے تڑپتے ہوئے لاشے اور مثلہ شدہ نعشیں ہیں۔ یہ تمام دوسری سنت کے

اجزاء ہیں۔ اب ان دونوں اجزاء یعنی سنت عبدیت اور سنت دعوت کو جمع کیجیے تو سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ایک وحدت کی حیثیت سے سامنے آئے گی۔

اب اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ کے طریقے میں سے نماز والی سنت تو لے لے مگر دعوت وتبلیغ والی سنت کو ساقط کر دے تو معلوم ہوا کہ اس کا تصورِ سنت بہت ناقص ہے۔ آج تو معاملہ یہ ہو رہا ہے کہ نماز میں بھی چھوٹی چھوٹی سنتوں پر ہی ساری گفتگو ہے۔ رفع یدین اور آمین بالجہر سے بات آگے نہیں بڑھتی۔ اگر ایسا ہو کہ اس پورے نقشے کے اندر سنت عبدیت اور سنت دعوت کو پوری طرح قائم کر کے ان جزئیات پر بھی گفتگو ہو تو کیا کہنے! نورٌ علیٰ نور والی کیفیت ہو گی۔ لیکن اس کے بغیر یہ مسائل بے بنیاد' بے وزن اور بے اصل ہیں۔ درحقیقت اُس سنت کا احیاء مطلوب ہے جو عبارت ہے آپ ﷺ کی پوری زندگی سے۔ مبارک ہیں' تہنیت کے قابل ہیں وہ لوگ جنہیں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے ساتھ شغف ہے' بایں معنی کہ سنت نبی اکرم ﷺ کے پورے طریق کا نام ہے' جس میں عبدیت بھی ہے اور دعوت بھی۔ اور یہ کام آسان نہیں ہے ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

لیکن مسواک کر کے یہ سمجھ لیا جائے کہ سو شہیدوں کا ثواب حاصل ہو گیا' کیا کہنے ہیں! اس سے زیادہ سہل الحصول (made easy) معاملہ تو کوئی ہے ہی نہیں۔ اس طرح وہ شہادت یعنی راہِ حق میں نقد جاں کا نذرانہ پیش کرنا تو بالکل ہی بے وقعت اور بے معنی ہو کر رہ گئی۔

ہمارے تصوراتِ دین اور تصوراتِ سنت میں جو عدم مناسبت اور عدم توازن نظر آ رہا ہے اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہم نے جزو کو کُل اور کُل کو جزو بنا رکھا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سارا معاملہ تلپٹ ہو گیا اور اقدار کی عمارت (value structure) بالکل مسمار ہو کر رہ گئی۔ لہٰذا اس کو ذہن میں رکھیے کہ صحیح اور حقیقی تصورِ سنت محیط ہے سنتِ عبدیت اور سنتِ دعوت کو۔ کتنی درست بات کہی ہے علامہ اقبال نے کہ: ؎

بمصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست!

ہمارے دین کی صحیح تعبیر یہی ہے کہ دین نام ہے اتباعِ رسول ﷺ کا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ چنانچہ پہنچاؤ اپنے آپ کو نبی اکرم ﷺ سے قریب تر اور اس کا واحد راستہ ہے آپؐ کی سنت کی پیروی، آپؐ کے طریق پر عمل، آپؐ کا کامل اتباع۔ اگر یہ نہیں ہے، یعنی اگر سنتِ رسولؐ تک رسائی نہیں ہوئی، اگر وہاں تک نہیں پہنچے تو یہ پھر تمام بولہبی ہے! میرے نزدیک یہ ہے صحیح تصورِ سنت۔ یہ ہے مقامِ سنت اور موجودہ دَور میں اتباعِ رسول ﷺ اور احیائے سنت کا تقاضا—— سنت عبدیت اور سنت دعوت کا اس کے تمام مراحل کے ساتھ اتباع۔

اللہ تعالیٰ کے ولی کون ہیں؟

اب ہم دوسری حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی 'صحیح بخاری' میں روایت کیا ہے۔ اس حدیث میں ایک تصور ایسا آ رہا ہے جس سے بعض اُن باتوں کا اثبات ہوگا جو صوفیاء کے حلقے کی ہیں۔ ہمارے ہاں اس معاملے میں بڑی افراط و تفریط ہے۔ یا تو وہ لوگ ہیں جو اِن باتوں کو سرے سے غلط اور سرتاسر باطل سمجھتے ہیں، ان کے کسی جزو کو بھی صحیح نہیں خیال کرتے۔ تو اس معاملے کا ایک رُخ یہ ہے۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ ساری گفتگو کراماتِ اولیاء ہی کی ہو رہی ہے، آگے پیچھے دوسری کوئی بات ہی نہیں۔ سارا معاملہ بزرگانِ دین کا ہے اور بزرگانِ دین کا سارا معاملہ کرامات اور خرقِ عادت واقعات پر موقوف نظر آتا ہے۔ اس حلقے کے کُل دینی تصورات اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ بس یہی چیزیں ان کا دین بن کر رہ گئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں بھی جو نقطۂ اعتدال ہے اس کو اس حدیث شریف کے حوالے سے اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ پہلے اس حدیث کے بارے میں چند اہم امور جان لیجیے۔ یہ حدیث قدسی ہے۔ یعنی یہ فرمانِ الٰہی ہے جس کو نقل فرما رہے ہیں خود جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ سے پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

روایت کرتے ہیں۔ سند کے اعتبار سے اس کا جو درجہ ہے‘ اس کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو اپنی ’’صحیح‘‘ میں روایت کیا ہے‘ جس کے متعلق علمائے اُمت کا اجماع ہے کہ یہ اَصَحُّ الکُتُب بعدَ کتابِ اللّٰہ یعنی قرآن حکیم کے بعد دنیا کی صحیح ترین کتاب ہے۔

((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ : مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِـیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ‘ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ ‘ وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَـیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ ‘ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ کُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا‘ وَلَئِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ)) (۱)

زیرمطالعہ حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے پہلی بات فرمائی: ((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِـیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ)) بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس کسی نے میرے کسی ولی (دوست) سے دشمنی کی تو اُس کے لیے میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے‘‘۔ یہاں لفظ ’’ولی‘‘ قابلِ غور ہے۔ معلوم ہوا کہ کچھ لوگ اللہ کے ولی (دوست) ہوتے ہیں۔ یہی بات قرآن مجید سے بھی بایں الفاظ ثابت ہے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾ (یونس) ’’آگاہ رہو‘ بلاشبہ جو اللہ کے ولی (دوست) ہیں ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے‘‘۔ پھر ولایت یک طرفہ نہیں‘ بلکہ اس کا معاملہ دوطرفہ ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۵۷) ’’اللہ اُن لوگوں کا ولی (دوست) ہے جو ایمان لائے ہیں‘ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے‘‘۔ اب یہ بات قرآن مجید اور حدیث شریف دونوں سے ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا ولی ہے اور اہل ایمان اللہ کے ولی ہیں۔ گویا ولایت کا معاملہ دوطرفہ ہے۔

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الرقاق‘ باب التواضع۔

اب اصل میں اس لفظ ''ولی'' کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ اس کے مفہوم کا بھی ہم نے اپنے ذہن میں کچھ اور ہی نقشہ قائم کر رکھا ہے۔ عربی بڑی وسیع المعانی زبان ہے۔ اس میں بہت سے الفاظ قریب المعانی ہوتے ہیں' لیکن ہر ایک کے معنی اور مفہوم میں ایک لطیف فرق ضرور ہوتا ہے۔ عربی میں دوست کے لیے جو الفاظ مستعمل ہیں' ان میں سے ہر ایک کے مفہوم میں فرق ہے۔ جیسے ''صَدیق'' کے معنی میں سچی اور بے تکلفی کی دوستی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ اور ''رفیق'' کے معنی میں باہمی دمسازی و ہمدردی کا جذبہ غالب ہوتا ہے۔ یہ رِفق سے بنا ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ کو محسوس کرنے والے ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اسی دوستی کے لیے ایک لفظ ہے ''خلیل''۔ یہ خُلّت سے بنا ہے' اس کے معنی میں انتہائی غالب محبت بھری دوستی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے استعمال ہوا ہے:

﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿١٢٥﴾﴾ (النساء)

''اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا دوست بنا لیا تھا''۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امتیازی شان ہے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

((لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا مِنْ اُمَّتِيْ لَاتَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ)) (۱)

''اگر میں اپنی اُمت میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو بناتا''۔

معلوم ہوا کہ اس پوری دنیا میں نبی اکرم ﷺ کا خلیل کوئی نہیں ہے۔ اگر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپ ؐ کے خلیل نہیں ہوئے تو اور کون ہوگا؟ پس آنجناب ﷺ نے خلت کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ سے رکھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے مقامِ رفیع کے اعتبار سے شرک فی الخُلّت کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کو بھی گوارا نہیں فرمایا۔ اب آیئے سمجھیں کہ ''ولی'' کے معنی کیا ہیں؟ ولی بھی عربی کا بڑا وسیع المعانی لفظ ہے۔ اس میں پشت پناہ' حمایتی' مددگار اور دوست کے مفاہیم شامل ہیں۔ ان سب کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب اس حدیث کے مضمون کو سمجھئے۔

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصلاۃ' باب الخوخۃ والممر فی المسجد۔

ولایت کی شرطِ لازم: حمیتِ دینی

اس حدیث کے مطالعے سے پہلی اور نمایاں بات یہ سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی کو ذلیل ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ واضح رہے کہ ایک ہے تکلیف میں نہ دیکھ سکنا اور ایک ہے اس کی ذلت و رسوائی کو برداشت نہ کرنا' جس کو ہم غیرت و حمیت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہت غیور ہے اور وہ اپنے کسی ولی کی ذلت و رسوائی کو برداشت نہیں کرتا۔ اسی طرح جو اللہ کے ولی ہیں وہ اس کے دین کے لیے غیرت و حمیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات کے لیے تو کوئی مدد نہیں چاہیے۔ اللہ کو اپنی ذاتی حیثیت سے تو کوئی پشت پناہ درکار نہیں۔ اللہ تعالیٰ عاجز نہیں ہے کہ اُسے اپنی ذات کے لیے حمایتی اور پشتیبان کی ضرورت ہو۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ۔ سورۂ بنی اسراءیل کے آخر میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ﴾ (آیت ۱۱۱) ''اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا پشتیبان ہو''۔ اللہ کو جو حمایت مطلوب ہے' اللہ کو جو پشت پناہی مطلوب ہے' اللہ کو جو غیرت درکار ہے' اللہ کو جس حمیت کی ضرورت ہے' وہ ہے اس کے دین کی۔ اپنے دین کے لیے وہ قرض بھی مانگتا ہے:

﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝﴾ (التغابن)

''اگر تم اللہ کو قرضِ حسن دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا' اللہ بڑا قدر دان بُردبار ہے۔''

اپنے دین کے لیے وہ مدد کی پکار بھی لگاتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ (الصّف: ۱۴)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کے مددگار بنو!''

اللہ کے دین کے لیے پیسہ خرچ کرو تو یہ اللہ کو قرضہ حسنہ دینا ہے۔ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرو تو یہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد شمار ہوگی۔ اللہ کے دین کی غیرت و حمیت ہے تو یہ اللہ کی ولایت ہے۔ یہ ہے حقیقی ولایت۔ وہ ولایت نہیں ہے کہ

دین سرنگوں ہو‘ ہوا کرے۔ حدود اللہ پامال ہوں‘ ہوتی رہیں۔ شعائر دین کا مذاق اڑ رہا ہو‘ اڑتا رہے۔ وہ اپنی تہجد میں‘ اپنے نوافل میں‘ اپنی تسبیحوں میں اور اپنے مراقبوں اور چلّوں میں مگن ہے۔ یہ ولایت نہیں‘ یہ عبادت گزاری نہیں‘ بلکہ یہ تو معاندانہ طرزِ عمل ہے۔ یہ نسبتِ ولایت نہیں ہے‘ بلکہ یہ تو مُنہ پر دے ماری جانے والی چیز ہے۔

یہاں وہ حدیث سامنے رکھیے جو ایک مؤمن صادق کے جسم و جان پر لرزہ طاری کر دیتی ہے اور قلبِ حساس کانپ کانپ جاتا ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : ((اَوْحَی اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرَئِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَۃَ کَذَا وَکَذَا بِاَھْلِھَا : قَالَ فَقَالَ : یَا رَبِّ اِنَّ فِیْھَا عَبْدَکَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِکَ طَرْفَۃَ عَیْنٍ، قَالَ فَقَالَ : اَقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ فَاِنَّ وَجْھَہٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ!))(رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

’’رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ فلاں فلاں بستیوں کو اُن کے رہنے والوں سمیت اُلٹ دو!‘‘ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس پر حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا: ’’اے میرے ربّ! ان میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے چشمِ زدن کی مدت تک بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی!‘‘ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ’’اُلٹ دو انہیں پہلے اس پر پھر دوسروں پر‘ اس لیے کہ اس کے چہرے کی رنگت کبھی میری (غیرت اور حمیت کی) وجہ سے متغیر نہیں ہوئی‘‘۔

غور کیجیے کہ اس بندۂ عابد کی عبادت گزاری کی شہادت کون دے رہے ہیں اور کیا دے رہے ہیں؟ گواہی دے رہے ہیں حضرت جبرئیل امینؑ‘ کوئی کرائے کا وکیل نہیں۔ وہاں دے رہے ہیں جہاں ابوجہل بھی جھوٹ نہیں بول سکے گا: ﴿یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ اور گواہی یہ دی جا رہی ہے کہ اس بندۂ عابد نے آنکھ جھپکنے کی مدت بھی اللہ تعالیٰ کی معصیت میں بسر نہیں کی۔ یہاں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ ایک شخص کی ذاتی عبادت اور نیکی کا یہ عالَم ہے۔ لیکن بارگاہِ خداوندی سے حکم یہ صادر ہوا کہ اَقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ

''اُلٹو پہلے اس پر پھر دوسروں پر''۔ کیوں؟ فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ ''اس لیے کہ اس کے چہرے کا رنگ میری (غیرت وحمیت) کی وجہ سے کبھی متغیر نہیں ہوا''۔ یہ بے غیرت اور بے حمیت انسان اسی سزا کا مستحق ہے کہ میرا عذاب پہلے اس پر نازل ہو' پھر دوسروں پر۔

حمیت و غیرت دین دراصل ایمان باللہ کا اہم ترین تقاضا ہے۔ اس حمیت و غیرتِ حق کے بغیر نہ ولایت کی کوئی ادنیٰ سی نسبت ہے نہ کوئی انفرادی عبادت' کوئی زہد اور کوئی ریاضت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے۔ تواصی بالحق' امر بالمعروف' نہی عن المنکر' دعوت الی اللہ' اعلائے کلمۃ اللہ کی سعی و جہد اسی غیرتِ حق اور حمیتِ دینی کے عملی مظاہر ہیں۔ یہ دین کی پشت پناہی اور نصرت ہے۔ ان چیزوں سے اگر زندگی خالی ہے اور انفرادی زہد وعبادت اور وظائف واَوراد ہیں تو ولایت کی نسبت کا کوئی سوال نہیں۔ ان تمام ریاضتوں کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پرِ کاہ کے برابر بھی نہ وقعت ہے اور نہ وزن ہے۔ کسی کی والدہ کی شان میں کوئی شخص کوئی گستاخانہ بات کہہ بیٹھے تو اس کے پورے جسم کا خون چہرے پر جمع ہو جائے گا' وہ مرنے مارنے پر تل جائے گا۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی ہوتی رہے' اس کے دین کا مذاق اڑتا رہے اور کوئی اپنی نفلی عبادت و ریاضت میں مگن رہے تو اسے ولایت سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ یہ تو ابلیس کا مشن ہے جسے علامہ اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

چنانچہ ولایت کا حقیقی مفہوم ہے غیرتِ حق' حمیت دینی' دین کی پشت پناہی' اس کی نصرت' اس کے غلبہ و اقامت کے لیے جہاد وقتال۔ اگر ولی کا یہ تصور آپ نے جان لیا تو اس کا منطقی نتیجہ بھی سمجھ میں آ جائے گا کہ: ((مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِـیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ ''جس نے میرے کسی ولی سے عداوت رکھی اُس کے خلاف میرا اعلانِ جنگ ہے!'' جو شخص ہمہ تن میرے دین کا حمایتی بنا ہوا ہے اُسے میں چھوڑ دوں' یہ کیسے ممکن ہے! جو اللہ کا

ولی ہے اللہ بھی تو اس کا ولی ہے۔ پس فرمایا کہ جس شخص نے میرے ولی کے ساتھ دشمنی رکھی تو اس کے خلاف میں اعلانِ جنگ کر چکا ہوں۔ یہاں ''قَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ'' فرمایا گیا۔ عربی میں فعل ماضی پر جب قَدْ لگتا ہے تو ''Present Perfect Tense'' کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ یعنی کام کا ہو چکنا مراد ہوتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی جنگ ہماری آپس کی جنگ کی طرح نہیں ہوتی۔ اللہ تلوار لے کر نہیں آتا۔ اللہ کی جنگ کے لیے مختلف کیفیات ہوتی ہیں۔ اللہ بھی چال چلتا ہے اور خفیہ تدبیر کرتا ہے: ﴿اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝﴾ (الطارق) ''یہ لوگ کچھ چالیں چل رہے ہیں اور میں بھی ایک چال چل رہا ہوں''۔ اور: ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝﴾ (آل عمران) ''اور وہ (بنی اسرائیل) خفیہ تدبیریں کرنے لگے اور اللہ نے بھی اپنی خفیہ تدبیر کی' اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے''۔ اللہ کی چالوں میں سے ایک بہت بڑی چال ہے ڈھیل دینا اور رسّی دراز کرنا۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝﴾ (الطارق) ''(اے نبیؐ!) پس ڈھیل دیجیے ان کافروں کو' ڈھیل دیجیے ان کو ایک مدت تک''۔ اللہ تعالیٰ کافروں کی رسّی دراز کرتا ہے تاکہ وہ ذرا اور جری ہو جائیں اور اپنا خبثِ باطن پوری طرح ظاہر کر لیں۔ اس کے بعد پھر اللہ کی پکڑ آ جاتی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (القلم) ''ہم ایسے طریقے سے ان کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی''۔ اس استدراج کے تصور سے مؤمنین صادقین ہر دَور میں لرزاں و ترساں رہے ہیں۔ ایک شخص غلط راستے پر جا رہا ہے اور لوگوں کو اپنی پیروی کی دعوت دے رہا ہے' ایک ہجوم اس کے پیچھے لگ گیا ہے' زندہ باد کے نعرے ہیں' پھولوں کی بارش ہے' اس کے ہاتھ اور پاؤں چومے جا رہے ہیں' وہ سمجھ رہا ہے کہ میں کامیاب ہوں۔ معلوم ہوا کہ یہ استدراج ہے' اللہ ڈور ڈھیلی کر رہا ہے' کانٹا حلق میں پھنسا ہوا ہے' وہ جا کہیں نہیں سکتا۔ یہ مہلت ہے۔ آگے فرمایا: ﴿وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝﴾ ''میں اُن کی رسّی دراز کر رہا ہوں' یقیناً میری چال بہت مضبوط اور پختہ ہے''۔ اس میں

کسی ضعف کا کوئی سوال نہیں ہے۔ میری ڈور تڑا کر کوئی مچھلی جا نہیں سکتی' لہٰذا مجھے جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔

بہرحال ولایت ایک دوطرفہ نسبت ہے بندے اور ربّ کے درمیان۔ اور جس نے بھی اللہ کے ولی سے دشمنی رکھی اس کے خلاف اللہ تعالیٰ اعلانِ جنگ فرما چکا۔ ولایت کی نسبت میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ وہ دراصل غیرت وحمیتِ دینی اور دین کی نصرت و پشت پناہی کا نام ہے۔ معلوم ہوا کہ سنت کا اور ولایت کا جو مفہوم میں نے بیان کیا ہے وہ دونوں باہم قریب آ گئے۔ کسی شہر کے بہت سے دروازے ہوں تو جس دروازے سے بھی داخل ہوں گے اُسی شہر میں داخل ہوں گے۔

تقرب الی اللہ کے ذرائع

زیر مطالعہ حدیث قدسی میں اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا تقرب حاصل کرنے کے دو ذرائع ہیں۔ یہاں ایک ضمنی لیکن اہم بات ذہن نشین کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جا سکتا ہے اور حاصل کیا جانا چاہیے۔ یہ کوئی نظریاتی و خیالی (theoretical) بات نہیں ہے۔ پوری شریعت' پوری طریقت اور کُل سلوک کا لبِّ لباب اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو وہ تقرب الی اللہ ہے۔ شریعت کے معنی بھی چلنا' طریقت کے معنی بھی چلنا اور سلوک کے معنی بھی چلنا ہیں۔ تینوں الفاظ کے مفاہیم میں باریک سا فرق ہے' لیکن تینوں میں چلنے کا مفہوم مشترک ہے۔ چلنا کس لیے ہوتا ہے؟ کسی منزل سے قریب ہونے کے لیے! منزل کیا ہے؟ وہ ہے قربِ الٰہی۔ اب دوسرے الفاظ دیکھئے: صراط' صراطِ مستقیم' صراط السوی' سواء السبیل' قصد السبیل۔ ان سب الفاظ میں راستے کا مفہوم مشترک ہے۔ راستے کا مقصود کیا ہوتا ہے؟ کسی منزل تک پہنچانا۔ منزل کیا ہے؟ اللہ کا تقرب۔ قرآن حکیم کے الفاظ ہیں: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ ؕ﴾ (النحل:۹) ''اور اللہ کے ذمے ہے سیدھا راستہ بتانا جب کہ ٹیڑھے راستے بھی بہت سے موجود ہیں''۔ قصد السبیل وہ سیدھا راستہ ہے جو عین اللہ تعالیٰ کے پاس لے جاتا ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں کہ یہ سڑک وہاں جا کر ختم

ہوتی ہے۔ ٹیڑھے راستے آپ کو اِدھر اُدھر بھٹکا دیں گے۔

اس حدیث میں جو بہت ہی قیمتی حدیث ہے' بہت ہی اہم حدیث ہے' تقرب الی اللہ کے دو ذریعے بتائے گئے ہیں۔ ایک تقرب بالفرائض اور دوسرا تقرب بالنوافل۔ ان دونوں میں بڑی عجیب (پیاری) نسبت ہے۔ تقرب بالفرائض اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب اور پسند ہے۔ چنانچہ فرمایا: ((وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ)) ''اور میرا بندہ میری کسی پسندیدہ شے کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنا چاہے تو میں نے اُس پر جو کچھ فرض کیا ہے اس سے بڑھ کر کسی اور ذریعے سے نہیں حاصل کر سکتا''۔ یہ ہے تقرب بالفرائض۔ اب دوسرے ذریعے کو سمجھئے وہ کیا ہے؟ وہ ہے تقرب بالنوافل۔ دیکھئے یہاں لفظ سنت نہیں آیا۔ یہاں فرض کے بعد فوراً نفل آ گیا۔ یہ ایک اور انداز سے ترتیب ہے۔ ایک وہ چیز ہے جو اللہ نے لازم کر دی ہے' فرض کر دی ہے (اس پر آگے بحث ہوگی کہ وہ فرض کیا کیا ہیں) ایک اس سے آگے کا مرحلہ ہے جو ایک بندۂ مؤمن اپنی آزاد مرضی سے کرتا ہے' وہ نفل ہے۔ یہ تقسیم دین کے ہر میدان اور ہر شعبے میں ہے۔ پنج وقتہ نماز فرض ہے' اس کے علاوہ نماز نفل بھی ہے۔ اسی طرح صدقاتِ واجبہ ہیں' زکوٰۃ ہے' عشر ہے' جبکہ صدقاتِ نافلہ بھی ہیں جو زکوٰۃ کے علاوہ کیے جانے چاہئیں۔ رمضان کے روزے فرض ہیں' باقی نفلی روزے جو جتنے چاہے رکھے۔ صاحبِ استطاعت پر ایک مرتبہ حج کرنا فرض ہے' باقی جتنے چاہے حج کرے وہ نفل ہیں۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ایک درجہ وہ ہے جس کا بجالانا لازم ہے۔ اس پر ایک اضافی اور بالاتر درجہ ہے وہ نفل ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں۔ اس میں جو جتنا چاہے آگے بڑھے' سبقت لے جانے کی کوشش کرے۔ لہٰذا پہلے فرمایا: ((وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ)) یعنی میں نے اپنے بندے پر جو چیزیں فرض کی ہیں' ان کو بجالا کر مجھ سے جو تقرب حاصل کرتا ہے تو یہ عمل مجھے محبوب ترین ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی فرمایا: ((وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ)

''اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے مجھ سے قریب تر ہوتا رہتا ہے''۔ میرا بندہ اگر نوافل کے ذریعے میرا تقرب تلاش کرتا رہے' کوشاں رہے' اس میں پیہم جدّ و جہد کرے' بڑھتا چلا جائے تو اس کا ایک نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ یہ کہ: ((حَتّٰی اُحِبَّهٗ)) ''یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں''۔ بڑا عجیب اور پیارا انداز ہے۔ شخصاً محبوب وہ ہے جو تقرب بالنوافل کی منزلیں طے کر رہا ہے' جبکہ طریقے کے اعتبار سے محبوب تقرب بالفرائض ہے۔ اب دیکھئے کہ محبوبیت خداوندی کے لیے الفاظ کیا آئے ہیں۔ اگر کوئی انسان یہ الفاظ کہتا تو وہ کافر اور مشرک قرار پاتا۔ یہ تو عینیت ہو جاتی۔ اس میں اللہ اور بندے کی تقسیم ختم ہو جاتی اور نمعلوم کتنی پیچیدگیاں اور دشواریاں پیش آتیں اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا۔ لیکن غور کیجیے یہ کلام کس کا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا! یہ حدیث قدسی ہے۔ نقل کون فرما رہے ہیں؟ الصادق المصدوق جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ۔ الفاظ ملاحظہ کیجیے: ((فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا)) ''پس جب میں اپنے اس بندے سے محبت کرتا ہوں تو میں اُس کی سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے' اور میں اُس کی بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' اور میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے' اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے''۔ اللہ اکبر! ہم کہہ سکتے ہیں یہ الفاظ؟ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' یہ حدیث قدسی ہے اور صحیح بخاری کی روایت ہے۔ اِن شاء اللہ آگے جب میں اس حدیث کی مزید شرح کروں گا تو توقع ہے کہ بات واضح ہو جائے گی۔

حدیث شریف میں آگے فرمایا: ((وَلَئِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ)) ''اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے تو میں لازماً اس کا سوال پورا کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں لازماً اسے پناہ دیتا ہوں''۔

کرامت اولیاء کا اثبات

اس حدیث شریف کے مطالب و مفاہیم سے جو ایک اہم نتیجہ نکلتا ہے اب اسے

جان لیجیے۔ کرامتِ اولیاء کے لیے یہ حدیث سند ہے' نص ہے۔ اللہ جس بندے کے پاؤں بن جائے اس کی رفتار کو آپ کس پیمانے سے ناپیں گے؟ برق کی رفتار تو اس سے کہیں پیچھے رہ جائے گی۔ اسی طرح جس کی آنکھ اللہ بن جائے اس کے بارے میں یہ سوچا جائے کہ اس نے یہ کیسے دیکھ لیا؟ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ کے منبر پر بیٹھے شام کا میدانِ جنگ کیسے دیکھ لیا؟ یہ ''کیسے'' کا سوال کسی کے ذہن میں آیا تو یہ حماقت اور پاگل پن ہے۔ اس میں کسی کو اگر استبعاد محسوس ہو تو اس نے موٹی سی بات نہیں سمجھی۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ))(۱) ''مؤمن کی فراست سے بچو اور ڈرو' اس لیے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھ رہا ہوتا ہے''۔ ایکسریز آپ کے جسم میں سے گزر جائیں تو اس کی خفیف ترین چیز کو بھی ظاہر کر دیتی ہیں' تو اللہ کا نور کس کس چیز کو چیر جائے گا!۔

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں!

یہ کیفیت ہے جو کبھی کبھی طاری ہوتی ہے۔ خود نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((وَلٰكِنْ يَاحَنْظَلَةُ سَاعَةً وَسَاعَةً))(۲) یعنی اے حنظلہ! یہ کیفیات مستقلاً نہیں ہوا کرتیں' کبھی کبھی نصیب ہوتی ہیں۔

پس اس حدیث سے اصولاً کراماتِ اولیاء کا اثبات ہوتا ہے۔ جو شخص اس حدیث کو صحیح مانتا ہے اسے اس بات کو بھی ماننا پڑے گا۔ اسے ان تمام باتوں کو تسلیم کرنا ہوگا جو اس میں بیان ہوئی ہیں۔ البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ ان کو ہم امکانی حد تک صحیح تسلیم کریں گے۔ کسی معین واقعہ کے متعلق یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی استدراج یا امہال و تمہیل کا معاملہ ہو' یا شیطان نے کسی کو کوئی بات سجھا دی ہو' کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ شیطان کے وار سے محفوظ صرف نبی ہوتا ہے' باقی

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ۔ باب ومن سورة الحجر۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب التوبة' باب فضل دوام الذکر والفکر ..... الخ۔

کوئی شخص محفوظ نہیں۔ بڑے سے بڑا ولی محفوظ نہیں۔ محفوظیت اور معصومیت صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا خاصّہ ہے۔ لہٰذا بڑے سے بڑے ولی کو بھی کسی وقت شیطان چکمہ دے سکتا ہے۔ اس نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو چکمہ دینے کی کوشش کی۔ احادیث میں ایسے واقعات موجود ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے ایسے چند واقعات سن کر فرمایا کہ تم نے پہچانا نہیں' یہ شیطان تھا! ساتھ ہی آنجناب ﷺ نے متنبہ فرما دیا تھا کہ:

((مَنْ رَآنِیْ فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِیْ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَتَمَثَّلُ فِیْ صُوْرَتِیْ))(۱)

''جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے واقعی مجھے ہی دیکھا ہے' کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا''۔

اگر کوئی یہ کہے کہ خواب میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی روح نے مجھ سے یہ کہا تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شیطانِ لعین نے کوئی الٹی پلٹی پڑھائی ہو اور کہا ہو کہ میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی روح ہوں۔

ان دونوں چیزوں کو پیش نظر رکھیے۔ مطلقاً انکار کر دینا کہ ہو ہی نہیں سکتا' ناممکن ہے' محال ہے' یہ طرزِ فکر اس حدیث کے خلاف ہے۔ اللہ اپنے اولیاء کا کان بنتا ہے' آنکھ بنتا ہے' ہاتھ بنتا ہے' پاؤں بنتا ہے' یہ اس حدیث سے ثابت ہے۔ لیکن کسی معین واقعے کے بارے میں حتمیت' قطعیت اور یقین کے ساتھ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ کسی شخص معین پر ایمان لانے کا ہمیں مکلّف نہیں ٹھہرایا گیا۔ جناب محمد ﷺ آخری ہستی ہیں جن پر ایمان کا مطالبہ ہے۔ آگے نہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر نہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر ایمان لانے کا مطالبہ ہے اور نہ کسی اور صحابی پر۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ جب خلفاء راشدین المہدیّین اور دیگر صحابہ کرامؓ پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں ہے تو اولیاء اللہ پر' چاہے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ہوں' چاہے معین الدین اجمیریؒ ہوں'

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب اثم من کذب علی النبی۔ وصحیح مسلم' کتاب الرؤیا' باب قول النبی ﷺ من رآنی فی المنام فقد رآنی۔

کسے باشد' ایمان لانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معصوم نہیں مانتے۔ ان سے بھی خطا ہو سکتی ہے' لیکن وہ خطائے اجتہادی ہو گی' اس میں بد نیتی یا نفسانیت ہرگز نہیں ہو گی۔ اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عَدُوْلٌ۔ چنانچہ اولیاء اللہ سے بھی غلطیوں کا صدور ممکن ہے۔ لہٰذا ایک تو یہ توازن پیدا کرنا ہے کہ ان چیزوں کا بالکل انکار کر دینا درحقیقت دین کی ایک اہم اور بہت بڑی حقیقت کی طرف سے اپنی آنکھوں کا بند کر لینا ہے۔ اگرچہ تعین کے ساتھ کسی بات کی نہ ہم تصدیق کریں گے' نہ توثیق کریں گے اور نہ تکذیب کریں گے۔ وہ جانے اور اس کا ربّ جانے۔ ہمارے لیے اصل دلیل اور حجت صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔ تصوف کے حلقے میں یہ بات مانی جاتی ہے کہ کسی ولی کا کشف دوسرے کے لیے دلیل و حجت نہیں ہے۔ ہاں اگر صاحب کشف کو یہ اطمینان ہو کہ مجھ پر صحیح بات منکشف ہوئی ہے تو اس کے لیے وہ کشف دلیل و حجت ہو جائے گا۔ آخر انسان کی فطرت بھی تو رہنمائی کرتی ہے۔ ایک گواہی اندر سے بھی تو اس کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر اسے یقین ہو جائے کہ اس کشف میں شیطنت نہیں' بلکہ یہ خدائی الہام اور رحمانی القاء ہے تو اس پر وہ حجت ہو جائے گا' بشرطیکہ وہ کتاب و سنت کے منافی نہ ہو۔ باقی رہا دوسروں کا معاملہ' تو اگر کسی ولی کا کشف قرآن و سنت کے مطابق بھی ہو تو کسی دوسرے کے لیے حجت نہیں ہے۔ دین میں حجت کوئی چیز ہے تو وہ صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔ جو بات مانی جائے گی وہ اس دلیل اور بنیاد پر مانی جائے گی۔ اُصولی طور پر اس بات کو صوفیاء کے حلقے بھی تسلیم کرتے ہیں۔

تقرب بالفرائض اور تقرب بالنوافل میں نسبت و تناسب

تقرب بالفرائض اور تقرب بالنوافل میں جو نسبت ہے اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اس کو میں دو مثالوں سے آپ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ افضل طریقہ جو ہے وہ تقرب بالفرائض ہے' اگرچہ اعلیٰ طریقہ اور بلند تر منزل جو ہے وہ تقرب بالنوافل ہے۔ ہمارا مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ افضل ترین ایمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے۔ لیکن ایک صحبت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ایمان کی گفتگو شروع ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ

نے صحابہؓ سے سوال کیا کہ ''تمہارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟'' یعنی سب سے زیادہ دلکش، دل آویز اور پیارا ایمان کس کا ہے؟ صحابہ کرامؓ نے خوب غور کر کے عرض کیا کہ ''ملائکہ کا ہے!'' آنجنابﷺ نے فرمایا: ''ملائکہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے وہ تو اللہ کے حضور میں ہیں، اللہ کا وجود اُن کے لیے غیب نہیں''۔ صحابہؓ نے پھر سوچا اور ترمیم کر کے عرض کیا کہ ''انبیاء کا ہے!'' آنحضرتﷺ نے فرمایا کہ ''وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے، ان پر تو وحی نازل ہوتی ہے، اللہ کے فرشتے ان کے پاس آتے جاتے ہیں اور اللہ کا پیغام لاتے ہیں!'' اب صحابہ کرامؓ نے جھجکتے جھجکتے کہا کہ ''پھر ہمارا ہے!'' نبی اکرمﷺ نے فرمایا: ''تم کیسے ایمان نہیں لاؤ گے، جبکہ تم نے مجھے دیکھا ہے، میری صحبت سے فیض یاب ہوئے ہو! میرے نزدیک خوبصورت ترین ایمان، دلکش ترین اور دل آویز ترین ایمان ہمارے اُن بھائیوں کا ہوگا جو ہمارے بعد آئیں گے، انہیں اللہ کی کتاب ملے گی اور وہ اس کے مشمولات پر ایمان لائیں گے۔ ان کا ایمان اَعجب یعنی حسین ترین، دلکش ترین اور خوبصورت ترین ہے''۔ یہ حدیث مشکوٰۃ میں ہے۔ میں نے اس کی تشریح بیان کی ہے۔ حدیث کا متن بھی ملاحظہ کر لیجیے:

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَیُّ الْخَلْقِ اَعْجَبُ اِلَيْكُمْ اِيْمَانًا؟)) قَالُوا: الْمَلَائِكَةُ ، قَالَ : ((وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ)) قَالُوْا : فَالنَّبِيُّوْنَ ، قَالَ: ((وَمَالَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَالْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ)) قَالُوْا : فَنَحْنُ، قَالَ: ((وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ)) قَالَ: فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((اِنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَيَّ اِيْمَانًا لَقَوْمٌ يَكُوْنُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ يَجِدُوْنَ صُحُفًا فِيْهَا كِتَابٌ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا فِيْهَا))(۱)

اس حدیث کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ ایمان کے افضل ہونے کے علاوہ اس کا ایک پہلو اَعْجَبُ ہونا بھی ہے۔ یہ بات تو عام طور پر ہم سب ہی جانتے ہیں

(۱) رواه البيهقي في دلائل النبوة، بحواله مشكوٰة المصابيح، كتاب المناقب، باب ثواب هذه الامة۔

کہ افضلیت وفضیلت کے اعتبار سے اُمت میں سے کسی بڑے سے بڑے ولی کا ایمان بھی اُس صحابی سے افضل نہیں ہوسکتا جس نے حالت ایمان میں نبی اکرم ﷺ کی صحبت مبارکہ چاہے تھوڑی دیر کے لیے اٹھائی ہو۔ مشہور محدث' فقیہہ' عابد و زاہد اور مجاہد بالسیف حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ میں سے ان کے نزدیک افضل کون ہے؟ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا چہرہ اس سوال پر تمتما اُٹھا اور انہوں نے فرمایا: ''خدا کی قسم! جس گھوڑے پر بیٹھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں جہاد کیا تھا اس گھوڑے کے مُنہ سے نکلنے والا جھاگ بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے افضل تھا''۔ پھر شخصیت کے تقابل کا کیا سوال! لیکن اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اَعجب ایمان (خوبصورت ترین ایمان' دل آویز اور حسین ترین ایمان) اُن خوش نصیبوں کا ہو گا جو نبی اکرم ﷺ کی رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت کے بعد' آپؐ کے دورِ سعید اور آپؐ کی صحبت مبارکہ سے محروم ہونے کے باوجود کتاب اللہ پر ایمان لانے کے ذریعے سے آپؐ کی رسالت پر ایمان لائیں گے اور دین کی جملہ باتوں کی تصدیق کریں گے اور ان پر عمل کی کوشش کریں گے۔ اب اس حوالے سے اس معاملے کو سمجھئے کہ افضل جو ہے وہ تقرب بالفرائض ہے اور اَعجب جو ہے وہ تقرب بالنوافل ہے۔

اسی بات کو اب دوسری مثال سے سمجھ لیجیے' اس سے بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ کسی دومنزلہ عمارت کا ذہن میں خیال جمائیے۔ بلند تر منزل کون سی ہے؟ یقیناً دوسری منزل۔ جبکہ اہم تر کون سی ہے؟ یقیناً آپ کا جواب ہوگا' پہلی منزل۔ پہلی منزل کا تصور تو دوسری منزل کے بغیر ممکن ہے' لیکن دوسری منزل کا کوئی تصور پہلی منزل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تعمیر کا سارا دارومدار پہلی منزل کی تعمیر پر ہے' اگرچہ وہ رہے گی نیچے۔ بلند تر منزل بہرحال دوسری منزل ہی ہوگی۔ یہ ہے تقرب بالنوافل کا وہ مقام جس کے بارے میں فرمایا گیا: ''اور جب میرا کوئی بندہ نوافل کے ذریعے میرا تقرب چاہتا ہے تو میں بھی اس کو محبوب رکھتا ہوں' اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اُس کا

کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے‘ اور اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے‘ اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے‘ اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اُسے لازماً دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ چاہتا ہے تو اُسے پناہ بھی لازماً دیتا ہوں‘‘۔ یہ ہے بلند تر اور اعلیٰ منزل۔ اونچی یقیناً یہی ہے۔

لیکن پہلی منزل یعنی تقرب بالفرائض والی منزل قائم کیے بغیر اگر کوئی دوسری منزل کے ساز وسامان کی فراہمی میں ہمہ تن مصروف ہے‘ اُسی کے لیے دوڑ دھوپ ہے‘ تو میرے نزدیک یہ ایک فضول اور احمقانہ فعل ہے۔ پہلی منزل کے بغیر دوسری منزل کی تعمیر ناممکنات میں سے ہے‘ کوئی صحیح الدماغ شخص اس بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اوّلیت پہلی منزل ہی کو حاصل ہے اور اللہ کو محبوب ترین یہی منزل ہے: ((وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ)) ’’اور میرا بندہ میری کسی محبوب شے کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنا چاہے تو میں نے اس پر جو کچھ فرض کیا ہے اس سے بڑھ کر کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کر سکتا‘‘۔

تصوف کے بعض مسائل کے سلسلے میں ہمارا جو موقف ہے وہ متذکرہ بالا حدیث کی روشنی میں واضح ہو گیا۔ البتہ اس ضمن میں ایک مزید وضاحت بہت ضروری ہے۔

سلوکِ محمدیؐ میں قرآن کی اہمیت

تصوف کے میدان میں اہم ترین بحث ذکر کی ہے‘ لیکن ہمارا تصورِ ذکر مروّجہ تصورِ ذکر سے مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک اصل ذکر‘ حقیقی ذکر‘ مجسم ذکر‘ مؤثر ترین ذکر قرآن مجید ہے‘ جس کو بھلا دیا گیا‘ جس کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ ہماری فکری‘ ذہنی اور عملی کج روی اور بے راہ روی کا اصل سبب یہی ہے کہ ذکر اپنے اصل ہدف سے ہٹ گیا ہے ع

آہ وہ تیرِ نیم کش‘ جس کا نہ ہو کوئی ہدف!

میں نے عرض کیا کہ ہمارے نزدیک اصل ذکر قرآن حکیم ہے۔ اس کے بے شمار شواہد قرآن حکیم سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اس وقت چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کرتا

ہوں۔سورۃ الحجر میں فرمایا:

﴿وَقَالُوْا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ﴾

''اور لوگ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر الذکر (قرآن مجید) نازل کیا گیا ہے! تو یقیناً دیوانہ ہے''۔

یہ کفارِ مکہ کا قول قرآن نے بیان کیا ہے۔اس میں منکرین نے بھی قرآن کو ''ذکر'' کہا ہے' جس کی توثیق اللہ تعالیٰ اسی سورت میں اس طرح فرماتا ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر)

''بیشک ہم نے اس الذکر (قرآن مجید) کو نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔

سورۃ النحل میں فرمایا:

﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ﴾

''اور ہم نے (اے نبیؐ) آپ کی طرف یہ الذکر (قرآن مجید) نازل کیا ہے' تاکہ آپ اس تعلیم کی جو آپ کی طرف لوگوں کے لیے نازل کی گئی ہے' ان کے سامنے توضیح وتشریح کریں اور شاید لوگ خود بھی غور وفکر کریں''۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ الذکر' مجسم ذکر' سرتاسر ذکر قرآن ہے۔اسے پڑھو' اسے حرزِ جان بناؤ' اسے ذہن میں اتارو' اس کو حفظ کرو۔اس کی تلاوت کرو جیسا کہ تلاوت کا حق ہے اور اس کے ذریعہ اپنے رات اور دن کو زندہ کرو۔ یہ ہے اصل ذکر۔

اس کے علاوہ نماز کے متعلق فرمایا: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ﴾ (طٰہٰ) ''نماز قائم کرو میرے ذکر کے لیے''۔گویا نماز کا مقصد ذکر ہے۔اور اس ضمن میں سنت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کیا ہے؟ آنحضور ﷺ کی رات کی نماز کا عالم یہ ہے کہ طویل قیام ہے اور اس میں قرآن کی طویل تلاوت ہے۔ایک ایک رکعت میں سورۃ البقرۃ' سورۂ آل عمران اور سورۃ النساء تین طویل ترین سورتوں تک کی تلاوت ہے۔اس کے علاوہ اذکارِ مسنونہ اور ادعیۂ ماثورہ ہیں۔لیکن یہ طریقے چھوڑ کر ہم نے ضربیں لگانی سیکھی ہیں'

خاص آسن ایجاد کیے ہیں' ہم نے نشست کے خاص انداز نکالے ہیں۔ یہ کہاں سے آئے؟ ان پر عمل کرنے والوں میں جو منصف مزاج لوگ ہیں وہ یہ بات مانتے ہیں کہ یہ طریقے رسول اللہ ﷺ سے منقول و ماثور نہیں ہیں' بلکہ یہ بعد کے لوگوں کے اپنے اجتہادی اور تجرباتی معاملات ہیں۔ لیکن ہمارے لیے اس معاملے میں بھی سنت نبویؐ اور سنت خلفائے راشدین مہدیینؓ ہی کو اختیار کرنے میں عافیت ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ ہم کسی سلوک کے قائل نہیں ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ سلوکِ محمدی ﷺ ہے جس پر ہم چلنا چاہتے ہیں۔ ہم نے سلوک اور سنت کو جمع کیا ہے۔ ہم نے سلوک کے غلط تصورات کو چھوڑا ہے جہاں نچلی منزل کی تعمیر کے بغیر اوپر کی منزل تعمیر کرنے کی کوشش ہوتی ہے' جہاں حمیت دینی اور غیرتِ دینی کا معاملہ خارج از بحث ہو گیا ہے۔ ہم نے ان تصورات کو ترک کیا ہے تو علیٰ وجہ البصیرت ترک کیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ تصوف کے جو مطلوبہ مقاصد ہیں ان کو ہم نہ مانتے ہوں اور ان کو نہ سمجھتے ہوں۔ تصوف کا اصل موضوع تطہیر قلب اور تعمیر سیرت ہے۔ ہم علیٰ وجہ البصیرت کہتے ہیں کہ اس کا اصل منبع و سرچشمہ قرآن حکیم ہے' جو شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ بھی ہے' هُدًى لِّلنَّاسِ بھی ہے' اَلذِّکر اور اَلذِّکریٰ بھی ہے۔ ربیع قلب بھی ہے' نورِ صدر بھی ہے۔ جلاءِ حزن بھی ہے اور ذَهَابِ هَمّ وَغَمّ بھی ہے۔ الغرض ہمارے نزدیک تزکیۂ نفس کا اصل ذریعہ ہے قرآن مجید۔ اس کا لبّ لباب ہے ایمان' اور ایمان کا لبّ لباب ہے توکل اور راضی بہ رضائے ربّ رہنا۔ یہی تصوف کا حاصل ہے۔ ؎

بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا!

کون اس کا انکار کرے گا! معاملہ ذرائع کا ہے۔ ہم نے سلوکِ محمدیؐ کو اختیار کیا ہے' جس کا منبع و سرچشمہ قرآن مجید ہے۔

تصورِ دین میں تبدیلی کے اسباب

سیرت نبویؐ کا مطالعہ کیجیے اور دیکھئے کہ نبی اکرم ﷺ کا سلوک کون سا تھا! آپ کو

صاف نظر آئے گا کہ اس میں اصل اور بنیادی اہمیت تقرب بالفرائض کی تھی' اور آپؐ فریضۂ شہادت علی الناس کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف تھے۔ جبکہ تقرب بالنوافل میں آپؐ جس مقام و مرتبہ پر تھے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس معاملے میں ہم کیا عرض کریں گے! آپ ﷺ نے خود فرمایا: ((وَاَیُّکُمْ مِّثْلِیْ اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ))(۱) ''تم میں سے کون میرے مانند ہوسکتا ہے؟ میں تو رات اپنے ربّ کے پاس بسر کرتا ہوں' وہ مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے''۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معاملہ دیکھئے کہ ان کا سلوک کون سا تھا؟ یہ سلوک بالفرائض تھا۔ ان کا سارا زور' ان کی ساری توجہ فرائض پر مرکوز نظر آتی ہے۔ میں جب ''دینی فرائض'' کا ہمہ گیر اور جامع تصور آپ کے سامنے رکھوں گا تو بات مزید واضح ہو جائے گی۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ بعد کے اَدوار میں ان تصوراتِ دینی اور سلوکِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر رفتہ رفتہ مختلف حجابات پڑتے چلے گئے' تا آنکہ یہ دینی تصورات حجابات میں ایسے مستور ہوئے کہ عوام تو عوام خواص کی آنکھوں سے بھی اوجھل ہو گئے۔ اب تو عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ دینی فرائض بس نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج کی عبادات میں محدود و محصور ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کے بھی چند نمایاں اسباب ہیں جن کو سمجھنا ضروری ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل تو ''اسلام'' بحیثیت دین موجود ہی نہیں تھا۔ موجود ہونا اور نافذ العمل ہونا تو درکنار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین توحید کو خود اُن کے جلیل القدر فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل گم کر چکی تھی اور اس پر مشرکانہ عقائد اور نظریات وتوہمات کا بھرپور غلبہ تھا۔ یہاں تک کہ مکہ مکرمہ میں جو گھر خالص اللہ کی عبادت کے لیے ان باپ بیٹوں نے تعمیر کیا تھا اس بیت اللہ میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے جن کی پرستش ہوتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لایا ہوا دین توحید کئی فرقوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ روح اور عمل دونوں اعتبارات سے توحیدِ خالص کا تصور مسخ ہو چکا تھا' حتیٰ کہ ان

---

(۱) متفق علیہ۔ تفصیلی حوالہ گزر چکا ہے۔

میں ایک ایسا فرقہ بھی موجود تھا جو حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتا تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا لایا ہوا دین توحید یونان و روم کی اصنام پرستی سے مغلوب ہو کر تثلیث کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ مجوسی آتش پرستی اور ثنویت (یزدان اور اہرمن) کے قائل تھے۔ الغرض پوری دنیا میں شرک کے اندھیارے چھائے ہوئے تھے۔

اس صورت حال کا تقاضا تھا کہ دین توحید کو عملاً قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ از روئے حکمِ الٰہی: ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ (الشوریٰ:۱۳) ''یہ کہ دین کو قائم کرو''۔ اس معرکۂ حق و باطل کے لیے خود کو تیار کرنا تھا۔ اس کے لیے اپنے قلب و ذہن کو بیدار کرنا تھا اور تقرب الی اللہ کے لیے تقرب بالفرائض کے پہلو بہ پہلو تقرب بالنوافل کو بھی معمولات میں شامل کرنا تھا۔ ان دونوں ذرائع سے اپنے فکر و نظر کو نورِ ایمان سے منور اور شوقِ شہادت سے مملو اور معمور کرنا تھا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے جاں نثار ساتھی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ہمیں دورِ نبویؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں یہی نقشہ نظر آتا ہے۔ یہ تھا صحابہ کرامؓ کا سلوک۔ اسی کی شہادت قرآن مجید، احادیث شریفہ اور سیرت کی تمام مستند کتب دیتی ہیں۔ اسی نقشہ کی علامہ اقبال نے یوں تعبیر کی ہے ؎

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!

البتہ بعد میں جب دین غالب ہو گیا، نہ صرف عرب بلکہ عراق، شام، فلسطین، ایران حتیٰ کہ افریقہ کے شمالی علاقے کے بہت بڑے حصے پر اللہ کے دین کا جھنڈا سربلند ہو گیا اور شریعت کا نفاذ عمل میں آ گیا تو اب منظر یہ تھا کہ اللہ کا حکم چل رہا ہے، اسلامی عدالتیں قائم ہیں، قاضی ہیں، فتاویٰ دیے جا رہے ہیں، شریعت خداوندی کے مطابق فیصلے ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اب وہ وقت آیا کہ تقرب بالفرائض کے ساتھ ساتھ تقرب بالنوافل کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔ چنانچہ اُس دَور میں بھی کثرت کے ساتھ ایسے حضرات نظر آتے ہیں جو تقرب بالفرائض کے ساتھ ساتھ تقرب بالنوافل میں بھی پورا

انہماک رکھتے تھے۔ تاریخ کی یہ بڑی عجیب اور بڑی پیاری شہادت ہے کہ جب اللہ کے دین توحید کی دعوت وتبلیغ اور نظامِ قسط وعدل کے قیام ونفاذ کے لیے مجاہدین اسلام ایران جیسی وقت کی عظیم ترین قوت سے نبرد آزما ہوئے اور اس کی مضبوط اور عظیم عسکری قوت ان مٹھی بھر اور ناقص و نامکمل اسلحہ جنگ کے حامل مجاہدین کے ایمان کی آہنی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے لگی تو ایرانی سپہ سالار رستم نے اپنے جاسوس بھیجے کہ معلوم کریں کہ ان بے سروسامان جنگجوؤں کی قوت کا اصل راز کیا ہے' تو اس کے مخبروں اور جاسوسوں نے اسے ان مجاہدین کے بارے میں بتایا: **هُمْ فُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ وَرُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ** یعنی دن میں یہ لوگ شہسوار اور مردانِ میدانِ کارزار ہیں اور ان کی راتیں اپنے اللہ کے حضور میں قیام وسجود' گریہ وزاری اور دعا ومناجات میں بسر ہوتی ہیں۔ ان کی داڑھیاں اور ان کی سجدہ گاہیں خشیت الٰہی کے آنسوؤں سے تر ہوتی ہیں— حالانکہ دنیا جنگ کے جن طور طریقوں سے واقف تھی اور آج بھی آگاہ ہے' وہ تو یہ ہیں کہ فوجیوں کی راتیں شراب وکباب اور شباب سے کھیلنے میں بسر ہوتی ہیں۔ یہ وہ عجوبۂ روزگار' انوکھے اور نرالے اللہ کے سپاہی تھے کہ جن کے متعلق دشمن کے جاسوس یہ شہادت دیتے ہیں کہ یہ لوگ رات کے راہب اور دن کے شہسوار ہیں۔ ایسے اولیاء اللہ سے جو بھی کبھی ٹکرایا وہ ریت کے ٹیلوں کی طرح بکھر گیا۔ پس یہ تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم کا سلوک۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بیت اللہ میں نماز کا ثواب ایک لاکھ گنا اور حرمِ نبویؐ میں پچاس ہزار گنا ہے۔ اس کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی نمازیں چھوڑ کر جہاد وقتال کے لیے نکلے۔ اس لیے کہ اللہ کے دین کو بالفعل قائم کرنے کی سعی وجہد سب سے بڑا فرضِ منصبی ہے۔ یہ کام حرمِ شریف اور حرمِ نبویؐ میں نمازیں ادا کرنے سے بھی زیادہ اجر وثواب کا باعث ہے۔ یہ تقرب بالفرائض میں شامل ہے' جس کے بغیر تقرب بالنوافل ممکن ہی نہیں۔

دورِ خلافت راشدہ کے بعد ہمیں اپنے بزرگانِ دین کی اکثریت میں تقرب

بالنوافل کثرت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اس کی توجیہہ بھی ہے' جواز بھی ہے اور اس کا صحیح مقام و محل بھی سمجھ میں آتا ہے۔ وہ یہ کہ اُس وقت کی معلوم و متمدن دنیا کے ایک بہت بڑے خطے پر اللہ کا دین قائم و نافذ ہو چکا تھا' اللہ ہی کا کلمہ اور جھنڈا سربلند تھا' ﴿وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا﴾ کا مشاہدہ دنیا چشمِ سر سے کر رہی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ تقرب بالفرائض کو صرف ارکانِ اسلام میں محدود سمجھنے کا تصور پختہ ہوتا چلا گیا اور تواصی بالحق' دعوت الی اللہ' امر بالمعروف و نہی عن المنکر' شہادت علی الناس' اقامت دین کے لیے جدوجہد اور قتال فی سبیل اللہ کو دینی فرائض کی فہرست سے خارج سمجھا جانے لگا' یہاں تک کہ ہمارے دینی نظامِ زندگی کا پورا قصر مسمار ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین اسلام بکمال و تمام دنیا کے کسی گوشے میں بھی قائم و نافذ نہیں رہا۔ اب صورتِ حال وہ ہو گئی تھی جس کو مولانا حالی نے بڑی دلسوزی کے ساتھ یوں تعبیر کیا ہے :ؔ

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ دینی فرائض کا جامع اور ہمہ گیر تصور اجاگر کیا جاتا اور پورے شد و مد سے تقرب بالفرائض پر زور دیا جاتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا' بلکہ سلوک کا جو راستہ (تقرب بالنوافل) تصوف نے متعین کیا تھا یہ قافلہ اُسی پر چلتا رہا۔ وہ ابھی تک اپنی اصل کی طرف لوٹ نہیں رہا' حالانکہ صورتِ حال یکسر بدل چکی ہے۔ اب پھر اسی سلوک کی ضرورت ہے جو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تھا۔

برعظیم پاک و ہند میں تجدیدی کوششیں

جن حضرات نے ہندوستان اور خاص طور پر دورِ مغلیہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ بات یقیناً جانتے ہوں گے کہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ہندوستان میں حکومتی سطح پر خرابیاں تھیں' فسق و فجور بھی تھا' اکبر کا دین الٰہی بھی آ گیا تھا' لیکن شریعت کا ڈھانچہ موجود تھا' شرعی عدالتیں قائم تھیں' قاضی موجود تھے۔ چنانچہ حضرت مجدّد الف ثانی نے تلوار نہیں اٹھائی' لیکن سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

کے احیاء کے لیے صوفیاء کے حلقوں میں سے جس بزرگ ہستی کی طرف سے پہلی مرتبہ کوئی زوردار دعوت اٹھی تو وہ شخصیت تھی حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی۔ اس کے بعد جب انگریز آ گیا اور ہمارے نظام کی پوری عمارت ہی زمین بوس ہوگئی تو اب ایک اور احمد اٹھا' اور یہ سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ تھے۔ انہوں نے جہاد وقتال کا نعرہ لگایا۔[1] انہوں نے کہا کہ ہمارا سلسلہ ''سلوکِ محمدیہ'' ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ سلوک کے چار مشہور سلاسل ہیں: سلسلۂ قادریہ' سلسلۂ نقشبندیہ' سلسلۂ چشتیہ اور سلسلۂ سہروردیہ۔ انہوںؒ نے نہایت زور دے کر کہا کہ ہمارا طریقہ اور سلوک وہ ہے جس میں جنگ اور قتال فی سبیل اللہ ہے' جس میں اللہ کے دین کے غلبے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ جانا ہے۔ یہ طریق و سلوکِ محمدیہؐ ہے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے۔ اُسی کی طرف ہم دعوت دے رہے ہیں اور اسی پر ہم عمل پیرا ہیں۔ اور اس سلسلۂ محمدیہ کا ذکر اوّلین ہے قرآن مجید۔

اسی تصور کو ہم نے علیٰ وجہ البصیرت اختیار کیا ہے جو سید احمد بریلوی شہیدؒ کے بقول طریق وسلوک محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے۔ تقرب الی اللہ کا ہمارا جو تصور ہے' طریقت اور سلوک کے بارے میں ہمارے جو نظریات ہیں' ہمارے نزدیک تقرب الی اللہ کے جو وسائل اور ذرائع ہیں' ان میں جو نسبت و تناسب ہے ان امور کے بارے میں مَیں نے اپنی امکانی حد تک وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور مجھے توقع ہے کہ ہمارا موقف آپ حضرات کے سامنے آ گیا ہوگا۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ آپ اس سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں۔ (جاری ہے)

---

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی کتاب ''پرانے چراغ'' میں ولی اللّٰہی حکمت کے متعلق یہ شعر نظر سے گزرا ؎

یہی ہے مختصراً حکمت ولی اللہ
جمے تو مدرسہ و خانقاہ اٹھے تو سپاہ (جمیل الرحمٰن)

شَهرٌ عَظِیمٌ ...... شَہرٌ مُبَارَکٌ

رمضان المبارک
تزکیہ وتربیت کا مہینہ

عتیق الرحمٰن صدیقی

لغوی اعتبار سے ''صوم'' کے معنی رکنے اور چپ رہنے کے ہیں۔ بعض مقامات پر اسے صبر سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ ضبط نفس' ثابت قدمی اور استقلال اسی مفہوم کے غماز ہیں۔ دراصل انسان زندگی کی شاہراہ پر چلتے ہوئے بعض اوقات ہوا و ہوس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے جادۂ اعتدال پر قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عبادات کا جو نظام وضع کیا ہے اس میں روزہ کا کردار بڑا اہم ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ ظاہری خواہشوں کے ساتھ اندرونی خواہشوں سے دل اور زبان کو محفوظ رکھا جائے۔ کھانے پینے اور جنسی ملاپ نفس کے ایسے پرزور اور بے پناہ قوت رکھنے والے بنیادی نوعیت کے مطالبات ہیں کہ انہیں زنجیریں پہنانا دشوار ہی نہیں دشوارتر ہے' اس لیے کہ بقائے ذات بھی انہی پر موقوف ہے اور بقائے جنس کا انحصار تو ہے ہی ان پر۔

آدمی میں توازن' تناسب اور اعتدال ہو اور مختلف امور میں اس نے توسط کی راہ اپنا رکھی ہو تو وہ زندگی میں بے شمار پریشانیوں اور تکلیفوں سے بچا رہتا ہے۔ اب یہ خوبیاں اُس میں کیسے پیدا ہوں' اسلام ان کا علاج ایک پاکیزہ اور صاف ستھرا ماحول پیدا کر کے کرتا ہے۔ ایک طاہر ومطہر ماحول کو بروئے کار لانے کے لیے وہ ایک طرف نماز کی اقامت پر زور دیتا ہے تاکہ پنجگانہ اوقات میں اس کے سامنے اس کے خالق و مالک کا تصور مستحضر رہے اور وہ اللہ کی زمین پر فساد برپا کرنے سے بچا رہے اور دوسری طرف قانونِ حدود متعین کر کے اسے محتاط رکھنے کا اہتمام کیا ہے۔

نماز کو قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے سال میں مہینہ بھر کے روزے بھی فرض کر

دیے۔ پہلی قوموں کا تذکرہ بھی کیا تاکہ یہ انہونی بات نہ رہے اور بتایا کہ یہ مشکل عبادت ان پر بھی فرض رہی اور پرہیزگار بنانے اور قدم قدم پر حق و باطل کے مابین فرق کا ادراک رکھنے کے لیے یہ عمل ضروری تھا۔ رمضان کے مہینے میں اس اہم مقصد کی تکمیل کے لیے قرآن اتارا گیا تاکہ مسلمان روزے کی حالت میں اسے بار بار پڑھے، غور کرے، سجود و قعود میں فکرمندی کا تسلسل قائم رکھے اور پھر اللہ کی بڑائی بیان کرے زبان سے بھی اور عمل سے بھی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ تشکر و امتنان کا جذبہ اس کے رگ و پے میں سرایت کر جائے اور مہینہ بھر کی بلاخیز ریاضت کے بعد طاغوت کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جائے اور اس ہدایت پر نازاں رہے جس سے اس کے اللہ نے اسے نوازا ہے اور اس معجز نما قوت کی بدولت نہ صرف اس کے روزمرہ کے معاملات درست رہیں بلکہ اجتماعی امور میں بھی اس کا رول مؤثر رہے۔

یہ استمداد اور قوت کار پیدا کرنے کے لیے لازمی ہے کہ ہمارا روزہ روایتی روزہ نہ ہو، بلکہ حقیقی روزہ ہو، یعنی روزہ ڈھال بن جائے بدکلامی کے خلاف، دنگا فساد اور گالم گلوچ کے خلاف، تاکہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کی تعمیل ممکن ہو۔ آپؐ نے فرمایا کہ:

((مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ (۱))

''جس کسی نے روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا وہ جان لے کہ اللہ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے''۔

نفس کے تین مطالبات پر صرف اس لیے بندشیں نہیں لگائی گئیں کہ بندہ بس بھوکا پیاسا رہے، بلکہ یہ تو باطنی طور پر اسے اجالنے کے منشور کا ایک اہم حصہ تھا، ایسا حصہ کہ جس میں ریا کا کوئی گزر نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ روزے میں ریا نہیں ہوا کرتی۔ ظاہر ہے کہ کسی عبادت میں نمود و نمائش اور ریا کا نہ ہونا یہ ضمانت فراہم کرتا ہے کہ بندہ اللہ سے جڑ رہا ہے، اس کی ذاتِ گرامی سے اس کا رابطہ زیادہ مضبوط ہو رہا ہے۔ ہم جب دیکھتے ہیں کہ اس عبادت کی نوعیت سراسر منفی ہے، یہ کچھ اعمال کے کرنے سے وجود میں نہیں آتی، بلکہ دیکھنے میں آتی ہی نہیں، تو گویا یہ ایک راز ہے اللہ اور بندے کے درمیان۔ یہ بھید اگر بھید ہی رہے تو یہ رفعتوں اور منزلتوں کا پیامی ہے۔

روزے کے لیے انتہائی ضروری اور اہم بات یہ ہے کہ یہ ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھا جائے، ایسے ہی راتوں کا قیام بھی ایمان اور احتساب کے ساتھ ہو اور مزید یہ کہ لیلۃ القدر

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب من لم یدع قول الزور والعمل به فی الصوم۔

کا قیام بھی ایمان اور احتساب کے ساتھ ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَـهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ، وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ، وَمَنْ قَامَ لَیْلَةَ الْقَدْرِ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ)) (متفق علیہ) ☆

''جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور احتساب کے ساتھ تو اس کے وہ سب گناہ معاف کر دیے جائیں گے جو اُس سے پہلے سرزد ہوئے ہوں گے' اور جس شخص نے رمضان میں قیام کیا (یعنی راتوں کو کھڑے ہو کر عبادت کی) ایمان اور احتساب کے ساتھ تو اس کے وہ قصور معاف کر دیے جائیں گے جو اس نے پہلے کیے ہوں گے' اور جس شخص نے لیلۃ القدر میں قیام کیا ایمان اور احتساب کے ساتھ تو اس کے وہ سب گناہ جو اُس نے پہلے کیے ہوں گے' معاف کر دیے جائیں گے''۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی ایمان اور احتساب کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ایمان کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے متعلق ایک مسلمان کا جو عقیدہ ہونا چاہیے وہ عقیدہ ذہن میں پوری طرح تازہ رہے اور احتساب کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ ہی کی رضا کا طالب ہو اور ہر وقت اپنے خیالات اور اپنے اعمال پر نظر رکھے کہ کہیں وہ اللہ کی رضا کے خلاف تو نہیں چل رہا ہے۔ ان دونوں چیزوں کے ساتھ جو شخص رمضان کے پورے روزے رکھ لے گا وہ اپنے پچھلے گناہ بخشوا لے جائے گا' اس لیے کہ اگر وہ کبھی سرکش اور نافرمان بندہ تھا بھی تو اب اس نے اپنے مالک کی طرف پوری طرح رجوع کر لیا اور **التّائبُ من الذنبِ کمن لا ذنبَ لهٗ** گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ تھا''۔ (خطبات' ص ۹۶)

مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ روزے کے آداب کو ہر لحظہ نگاہ میں رکھے' روزے کا آغاز بھی بخیر ہو اور انجام بھی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں اوقات کے لیے باقاعدہ ایک نقشہ کار تجویز فرمایا ہے۔ سحری کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السَّحُوْرِ بَرَکَةً)) [۱]

☆ صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب من صام رمضان ایمانا واحتسابا ونیة......الخ۔ وصحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب الترغیب فی قیام رمضان وھو التراویح۔

''سحری کھالیا کرو' کیونکہ سحری کھانے میں بڑی برکت ہے''۔

اورافطار کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا :

((لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَّا عَجَّلُوا الْفِطْرَ)) (۲)

''جب تک لوگ افطار کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے حالت خیر میں رہیں گے''۔

گویا اپنے ذوق اور رجحان کی پیروی کرنے کے بجائے نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کی پیروی کی جائے' نہ یہ کہ رات کو ہی کھانا کھا کر سو جائے اور نہ یہ کہ سورج غروب ہونے کے بعد اندھیرا چھا جانے کا انتظار کرتا رہے۔ سحری کے وقت نہ اٹھنا ایک بہت بڑی برکت سے محروم ہونے کے مترادف ہے اور افطار میں دیر لگانا حالت خیر کے ختم ہو جانے کا مصداق ہے۔ یعنی تقویٰ کا حصول اس امر پر موقوف ہے کہ نبی کریم ﷺ کے فرمان کی اطاعت کرتے ہوئے نہ تو سحری کے کھانے میں حدِّ اعتدال سے تجاوز کیا جائے اور نہ افطار میں کام و دہن کی لذتوں کی تمام حدود کو پھاندا جائے' بلکہ منشائے ایزدی کو سامنے رکھا جائے۔

سحری کھانے کے لیے اٹھنے کا ایک نہایت اہم فائدہ یہ ہے کہ تہجد کی نماز کا اہتمام ممکن ہو جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ باقاعدگی سے تہجد کی نماز ادا فرماتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کے التزام کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ قرآن حکیم میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (بنی اسراء یل:۷۹)

''اور شب کے کچھ حصے میں تہجد پڑھا کیجیے! یہ آپ کے لیے خدا کا مزید فضل ہے''۔

تہجد کا اہتمام کرنے والوں کو قرآن نے محسن اور متقی کے خوبصورت القابات سے نوازتے ہوئے ان کی یہ صفت بیان فرمائی ہے:

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝﴾

(الذّٰریٰت)

''وہ رات کے تھوڑے حصے میں سوتے تھے' اور سحر کے اوقات استغفار کیا کرتے تھے''۔

ظاہر ہے کہ تہجد کی نماز نفس و اخلاق کا تزکیہ کرنے اور راہِ حق میں صبر و ثبات کی قوت فراہم کرنے کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب برکة السحور من غیر ایجاب۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل السحور ..... الخ۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب تعجیل الافطار۔

﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیۡلِ هِیَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّاَقۡوَمُ قِیۡلًا﴾ (المزّمّل)

''بلاشبہ شب کا اٹھنا نفس کو خوب ہی روندنے والا ہے اور نہایت ہی درست ہے اس وقت کا ذکر''۔

فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل نماز شب میں پڑھی جانے والی تہجد کی نماز ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے: ''تہجد کی نماز کا التزام کرو' یہ نیک لوگوں کی خصلت ہے اور خدا سے تمہیں قریب کرنے والی' گناہوں کو مٹانے والی اور گناہوں سے بچانے والی ہے اور جسم سے بیماریوں کو بھگانے والی ہے''۔ نیند کو توڑ کر اٹھنا ایک مشکل اور دشوار کام ہے۔ عام دنوں میں اس کا انصرام سہل اور آسان نہیں' اس لیے رمضان کے دنوں میں سحری کے وقت کو غنیمت جانتے ہوئے تہجد کی نماز پڑھی جاتی رہے تو یہ اللہ سے لو لگانے کا ایک اہم ذریعہ ہے: ؎

عطار ہو' رومی ہو' رازی ہو' غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!

یوں اپنے ربّ سے سرگوشیاں کرنے والا بندہ جذب وشوق کی اس لازوال قوت سے سرشار ہو جاتا ہے کہ ابلیس لرزہ براندام ہو جاتا ہے اور خطرے کی گھنٹی یوں بجاتا ہے: ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو!

ہم دیکھتے ہیں کہ رمضان کا مہینہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے:

﴿شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا''۔

اللہ تعالیٰ نے روزے کی ایک طرح سے منفرد نوعیت کی عظیم عبادت کے لیے وہ مہینہ منتخب فرمایا کہ جس میں اس نے ایک معجز نما' انقلاب آفریں اور ہدایت وموعظت سے لبریز کتاب اتاری۔ دن میں روزہ رکھنے کا حکم صادر ہوا اور رات کو قیام کا' جس میں قرآن سنا بھی جائے اور پڑھا بھی جائے۔ پورے مہینے میں ایک بار مکمل قرآن کو ترتیب سے پڑھنے کے عمل کو سنت مؤکدہ قرار دیا گیا۔ ہمارے نبی حضرت محمدﷺ ہر سال ماہِ صیام میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو پورا قرآن سنایا کرتے تھے۔ جس سال آپؐ دنیا سے رخصت ہوئے اس سال

آپؐ نے جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ دو بار قرآن کا دورہ فرمایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی کم از کم ایک بار تراویح میں پورا قرآن سننے اور سنانے کا اہتمام فرماتے تھے۔ حضرت خالد بن معدانؒ کی روایت ہے کہ قرآن سننے کا اجر وثواب قرآن پڑھنے سے دوہرا ہے۔

نبی کریم ﷺ کو قرآن پڑھوا کر سننے کا بہت شوق تھا۔ ایک بار آپؐ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ وہ قرآن پڑھ کر سنائیں۔ جواب میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا کہ ''حضور! میں آپ کو سناؤں؟ آپؐ پر تو قرآن نازل ہوا ہے!'' آپؐ نے فرمایا: ''ہاں سناؤ! مجھے اچھا لگتا ہے کہ دوسرا پڑھے اور میں سنوں''۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے سورۃ النساء پڑھنا شروع کی اور جب آپؓ اس آیت پر پہنچے: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ (النساء) ''پھر سوچو اُس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور اِن لوگوں پر آپؐ کو گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے؟'' تو آپؐ نے فرمایا: ''بس، بس''۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں''۔ (بخاری)

شرط یہ ہے کہ قرآن نہایت توجہ اور انہماک سے سنا جائے' اور جب پڑھا جائے تو بھی غور و تدبر سے اور اس عزم کے ساتھ کہ اس کے اوامر کو بجا لانا ہے اور اس کے نواہی سے مجتنب رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (صٓ) ''کتاب جو ہم نے آپؐ کی طرف بھیجی ہے' بڑی برکت والی ہے' تاکہ لوگ اس کی آیات پر غور و فکر کریں اور اہل عقل اس سے نصیحت حاصل کریں''۔ بندۂ مؤمن اس کتابِ حکیم کو اخلاصِ نیت کے ساتھ پڑھے' خوش الحانی اور دلبستگی کے ساتھ تلاوت کرے۔ یکسوئی بھی ہو اور عاجزی بھی۔ اسے کتابِ ہدایت' کتاب انقلاب اور منبع رشد و ہدایت سمجھ کر پڑھے تو ایسے ہی لوگوں کے دلوں کا زنگ دُور ہوتا ہے' قلب و روح کا تزکیہ ہوتا ہے اور تعلق باللہ میں مضبوطی آتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی آخری خطبہ میں یہی فرمایا تھا:

((وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ كِتَابُ اللّٰهِ))(۱)

''اور میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس کا سرِشتہ اگر تم مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو تم تاابد (کبھی) گمراہ نہیں ہو گے' وہ چیز ہے کتاب اللہ''۔

(۱) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجة النبی ﷺ۔

رمضان کے مبارک مہینے میں بندۂ مؤمن اگر قرآن کو تھام لے‘ اسے حرزِ جاں بنالے اور اس سے چمٹ جائے تو وہ یقیناً اندھیروں میں بھٹکے گا نہیں‘ بلکہ ہدایت کی روشنی سے منور رہے گا۔ یہ ہے ارمغانِ رمضان۔ نوید جاں فزا ہے خدا کے دامن رحمت سے وابستہ رہنے کے لیے ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

رمضان المبارک کا پہلا عشرہ رحمتوں کا نقیب ہے‘ دوسرا مغفرت کا داعی ہے اور تیسرا جہنم کی آگ سے آزادی کا پیام بر ہے‘ مگر یہ سب کچھ مشروط ہے ایمان اور احتساب کے ساتھ اور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے تناظر میں کہ:

((اِذَا کَانَ یَوْمُ صَوْمِ اَحَدِکُمْ فَلَا یَرْفُثْ وَلَا یَصْخَبْ ، فَاِنْ سَابَّہٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَہٗ فَلْیَقُلْ اِنِّی امْرُؤٌ صَائِمٌ)) (۱)

’’جب تم میں سے کسی کا روزے کا دن ہو تو وہ نہ تو بے حیائی کا مظاہرہ کرے اور نہ ہی بدزبانی کا۔ پھر اگر کوئی اس سے گالم گلوچ یا لڑائی جھگڑا کرے تو کہے کہ (بھائی) میں تو روزہ دار ہوں!‘‘

رمضان کے بہار آفرین اوقات میں‘ اشکبار ساعتوں میں‘ سعادت آمیز لمحوں میں وہ تسلسل سے استغفار کرتا رہے۔ قدم قدم پر اپنے روزے کی حفاظت کرے۔ آخری عشرے میں ممکن ہو تو اعتکاف کرے‘ قدر کی رات پر اس کا دھیان رہے۔ یوں جلوتوں کے ساتھ ساتھ خلوتوں سے لطف اندوز ہو‘ ان لمحوں میں فکر و عمل کی ساری قوتوں کو اللہ کی یاد میں صرف کر دے۔ ان سرور آمیز گھڑیوں میں قرآن پاک کو ٹھہر ٹھہر کر‘ غور و فکر کرتے ہوئے پڑھے اور اللہ سے دل کی کشود چاہے‘ دل کے بند کواڑ کے کھلنے کے لیے اللہ کے حضور ملتجی ہو‘ تاکہ وہ انوار اس کے قلب میں جذب ہو جائیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ، اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ)) (۲)

’’لوگو! آگاہ ہو جاؤ‘ یقیناً تمہارے جسم میں ایک لوتھڑا ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو پورا وجود درست ہو جائے گا اور اگر اس میں روگ اور خرابی ہو تو پورے وجود

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الصوم‘ باب ھل یقول انی صائم اذا شتم۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الصیام‘ باب فضل الصیام۔

(۲) سنن ابن ماجہ‘ کتاب الفتن‘ باب الوقوف عند الشبہات۔

میں وہ خرابی سرایت کر جائے گی! آگاہ ہو جاؤ وہ لوتھڑا قلب ہے''۔

اللہ تعالیٰ سے مسلسل درخواست کرے کہ:

''اے اللہ' میں تیرا غلام' تیرے غلام کا بیٹا اور تیری لونڈی کا بیٹا ہوں' میری پیشانی تیری مٹھی میں ہے' مجھ پر تیرا حکم جاری ہے' میرے بارے میں تیرا فیصلہ برحق ہے۔ میں تجھ سے تیرے ہر اس نام کے واسطے سے جو تیرا ہے' جس سے تو نے اپنے آپ کو پکارا ہے یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں اتارا ہے یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے' یہ درخواست کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار' میرے سینے کا نور' میرے غم کا مداوا اور میرے فکر و پریشانی کا علاج بنا دے''۔ (۱)

جذب و شوق سے معمور یہ لمحاتِ رمضان متاعِ بے بہا ہیں' انمول خزینہ ہیں۔ ان کو سمیٹنے کے لیے انھی خطوط پر سرگرم رہنا چاہیے جو ہم نے مندرجہ بالا سطور میں بیان کیے ہیں۔ جب ہم پورے احساس و شعور کے ساتھ اس راہ پر جادہ پیما رہیں گے تو پھر ہمارے اندر وہ عظیم قوت رونما ہو گی جو ہمیں شب و روز طاغوت سے نبرد آزما رکھے گی' ناجائز خواہشات کے سامنے ہم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں گی' حلال و حرام کے مابین فرق کو ہم ہمیشہ ملحوظ رکھ سکیں گے' زر و جواہر کی چکا چوند سے متاثر نہ ہوں گے' اپنوں اور بیگانوں کے حقوق ادا کرتے رہیں گے اور چوکنے رہیں گے کہ کسی لحظہ اپنے منصبی فرائض سے پہلوتہی نہ ہونے پائے' اپنی ذات سے بھی انصاف کر سکیں گے اور دوسروں سے بھی بھلائی سے پیش آئیں گے' معروف کی تلقین اپنا فرض گردانیں گے اور منکرات کی روک تھام کو اپنی ذمہ داری سمجھیں گے۔ اللہ کی دھرتی پر اس کے آئین کی تنفیذ کے لیے ہمہ پہلو سرگرم اور فعال رہیں گے۔ صرف توانا الفاظ پر تکیہ نہیں کریں گے بلکہ ان کی معنویت سے سرشار رہ کر اپنے حقیقی اہداف کی طرف بڑھتے چلے جائیں گے۔ تقویٰ کے جوہر کی نمود کا سرچشمہ ایسی ہی عنبریں ساعتوں سے پھوٹتا ہے۔ آئیں اور جھولیاں بھر لیں تاکہ سال کے بقیہ گیارہ مہینوں میں بھی یہ حسنات ضوفشاں رہیں۔ اللہ نہ کرے کہ ہم صرف روایت کو نبھاتے رہیں اور ہماری سرگرمیاں روح سے خالی رہیں اور یوں بھوک پیاس اور رت جگے کے سوا ہمارے ہاتھ کچھ نہ آئے ——— ہمارا مالک اور ہمارا آقا ہمیں حقیقی روزہ رکھنے کی توفیق دے! اور یوں ہم اس صبر آزما' جاں کسل اور پرمشقت آزمائش میں سرخرو ہو کر عید کی خوشیوں سے بہرہ مند ہوں۔ آمین!

---

(۱) اس دُعا کا عربی متن اسی شمارے میں شائع شدہ مضمون ''قربِ الٰہی کے دو مراتب'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

روزہ اور تہذیبِ نفس

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ تعالیٰ الحکیم ہے‘ چنانچہ اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔ اس نے جو چیز تخلیق کی حق کے ساتھ کی‘ جو حکم دیا وہ سراسر مفید اور بامقصد دیا۔ اپنے بندوں پر نماز فرض کی تو اس لیے کہ اُن کا کردار سدھر جائے‘ وہ معاشرے کے مفید شہری بن جائیں‘ انہیں برائیوں اور فحش کاموں سے نفرت ہو جائے‘ وہ سچ مچ اللہ کے بندے بن جائیں‘ انہیں اپنے خالق کی معرفت حاصل ہو جائے اور وہ باکردار اور خوش خصال بن جائیں۔ اُس نے زکوٰۃ فرض کی تو اس لیے کہ دولت مندوں کی مال کے ساتھ محبت کو اعتدال پر لایا جائے اور معاشرے کے محروم طبقات مثلاً مسکینوں‘ محتاجوں‘ یتیموں‘ بیواؤں اور بے سہارا لوگوں وغیرہ کے لیے گزران کا سامان ہو جائے۔ اسی طرح رمضان کے ایک ماہ کے روزے بھی فرض کیے گئے تاکہ اہل ایمان ایک مہینہ بھوک اور پیاس برداشت کریں اور انہیں اس بات کا خوب اندازہ ہو جائے کہ جن لوگوں کو دو وقت پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی وہ کس قدر تکلیف میں ہیں اور وہ لوگ کس طرح گزر بسر کرتے ہیں جن کے بچوں کو ضروریاتِ زندگی بھی میسر نہیں! یہ احساس دولت مندوں میں ہمدردی اور غمگساری پیدا کرتا ہے‘ جس کے انسانی کردار پر بڑے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ روزہ کے دوران جھوٹ‘ غیبت‘ وعدہ خلافی‘ بدکلامی وغیرہ جیسی اخلاقی برائیوں سے دور رہنے کا حکم ہے۔ جو شخص شعوری طور پر ارادہ کر کے اس ماہ میں ان برائیوں سے بچنے کی کوشش کرے گا رمضان گزر جانے کے بعد وہ لازماً اپنے اقوال و افعال اور احوال میں تبدیلی محسوس کرے گا۔ اُس کی زندگی میں ''احتیاط'' آ چکی ہوگی اور یہی رمضان کے روزوں کا مقصد ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾﴾ (البقرۃ)

aor tahzeeb

''اے اہل ایمان! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے' جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا' تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ''۔

گویا روزہ پرہیز کرنا سکھاتا ہے۔

انسان کی پیدائش بذاتِ خود بامقصد ہے۔ اسے خالق و مالک کی بندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے' جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ (الذّٰریٰت) ''میں نے انسانوں اور جنوں کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے''۔ اور عبادت اور بندگی یہ ہے کہ انسان کے شب و روز اللہ کی اطاعت میں گزریں۔ اللہ نے بعض چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور بعض سے رُکنے کا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے معروف پر عمل کرتا ہے اور منکرات سے رکتا ہے تو یوں سمجھئے کہ وہ اپنی تخلیق کا مقصد پورا کر رہا ہے۔ پوری زندگی احکاماتِ الٰہی کے مطابق گزارنا کوئی آسان کام نہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر مہربان اور رحیم ہے اس لیے اس نے قدم قدم پر انسان کو راہ نمائی میسر کی ہے۔ رمضان المبارک اُسی راہ نمائی کا مظہر ہے کہ یہ رحمتوں اور برکتوں بھرا مہینہ اہل ایمان کے لیے سازگار ماحول مہیا کرتا ہے جس میں نیکیوں کا اختیار کرنا اور برائیوں سے رکنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ اس مہینے کو اگر پورے آداب کے ساتھ گزار لیا جائے تو کردار میں مثبت تبدیلی ضرور رونما ہوگی۔

رمضان شریف انسان کو اپنی تربیت کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس ماہ میں حاصل کی ہوئی تربیت انسان کے کردار و عمل پر گہرے نقوش چھوڑتی ہے۔ اس میں محروم طبقوں کے ساتھ اُنس و محبت اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے' اسے اپنے نفس کی کمزوریوں کا پتا چلتا ہے اور روحانی اَسقام کو دور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے نفسانی خواہشات کو چھوڑتا ہے اور کھانے پینے میں وقت کی پابندی کرتا اور بسیار خوری سے رکتا ہے اور اس طرح سے کئی جسمانی عوارض سے نجات پالیتا ہے۔ کھانے پینے کے معاملے میں اگر وہ کم خوراکی کو معمول بنا لے تو گویا اسے صحت مند زندگی گزارنے کا گُر ہاتھ آ گیا' اور یہ رمضان کی برکت سے ہی ہوسکتا ہے۔

اس کے برعکس اگر رمضان مبارک کے سعید اور مقدس شب و روز سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو یہ ایسی بدنصیبی ہوگی کہ جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((رَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ دَخَلَ عَلَيْهِ رَمَضَانُ ثُمَّ انْسَلَخَ قَبْلَ اَنْ يُغْفَرَ لَهُ))(۱)

(۱) سنن الترمذی' کتاب الدعوات' باب قول رسول اللہ ﷺ رغم انف رجل۔

''برباد ہوا وہ شخص جس نے رمضان کا مہینہ پایا مگر وہ اس حال میں گزر گیا کہ اس کی بخشش نہ ہوسکی''۔

رمضان کی برکت سے نیکیاں پھلتی پھولتی ہیں۔ رمضان کے دوران بھلائی کے کام میں خرچ کیا ہوا ایک روپیہ ستر روپے خرچ کرنے کے برابر ہے۔ نفل کا ثواب فرض کے برابر اور فرض کا ثواب ستر گنا بڑھ جاتا ہے۔ پس اس شخص کے خسران کا کوئی اندازہ کرسکتا ہے جس نے رمضان کے شب و روز میں نیکیاں کمانے کا خاص اہتمام نہ کیا اور رمضان گزر گیا؟

بعض لوگ روزہ تو رکھتے ہیں مگر اُن کا روزہ صرف بھوک اور پیاس تک محدود ہوتا ہے۔ ایسے لوگ روزے کے مقصد سے ناآشنا ہیں اور انہیں رمضان کے دوران دن کے روزے اور رات کے قیام سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ بھوک اور پیاس کی تکلیف تو برداشت کرتے ہیں مگر کوئی حقیقی فائدہ نہیں پاسکتے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ))(۱)

''جو آدمی روزہ رکھتے ہوئے باطل کلام اور باطل کام نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کے بھوکا پیاسا رہنے کی کوئی ضرورت نہیں''۔

پس روزے کے آداب کو ملحوظ نہ رکھنا روزے کے حقیقی فوائد سے محروم رہنا ہے۔ روزہ تو پورے جسم کا ہے۔ آنکھ کا بھی روزہ ہے کہ نگاہ اس طرف نہ اٹھے جدھر سے روکا گیا ہے۔ کان کا بھی روزہ ہے کہ لہو ولعب اور گانے بجانے کی آوازوں سے کانوں کو محفوظ رکھا جائے۔ زبان کا بھی روزہ ہے کہ انسان جھوٹ، غیبت اور چغلی وغیرہ سے باز رہے۔ ہاتھ اور پاؤں کا بھی روزہ ہے کہ ہاتھ کسی کو نقصان نہ پہنچائیں اور پاؤں کسی گناہ کے کام کی طرف نہ اُٹھیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

((رُبَّ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ اِلَّا الْجُوْعُ وَرُبَّ قَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ قِيَامِهٖ اِلَّا السَّهَرُ))(۲)

''بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جن کو بھوک اور پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بہت سے رات کو جاگنے والے ایسے ہیں جنہیں رت جگے کے سوا کچھ نہیں ملتا''۔

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب الصوم، باب من لم يدع قول الزور والعمل به فی الصوم۔

(۲) سنن ابن ماجه، كتاب الصيام، باب ما جاء فی الغيبة والرفص للصائم۔

یعنی جب رمضان کے صیام و قیام سے کردار وعمل میں مثبت تبدیلی نہ آئی تو روزے کا کیا فائدہ؟

حدیث میں آتا ہے کہ ''جب رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو شیاطین اور سرکش جنات جکڑ دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے سارے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی دروازہ بھی کھلا نہیں رکھا جاتا' اور جنت کے تمام دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی دروازہ بھی بند نہیں رکھا جاتا' اور منادی کرنے والا منادی کرتا ہے کہ ''اے خیر اور نیکی کے طالب! قدم آگے بڑھا' اور اے بدی اور بدکرداری کے شائق! رک جا' آگے نہ آ!'' اور اللہ کی طرف سے بہت سے بندوں کو دوزخ سے رہائی دی جاتی ہے اور ایسا رمضان کی ہر رات میں ہوتا رہتا ہے''۔ (جامع ترمذی' سنن ابن ماجہ)

اس حدیث کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان شریف میں اللہ تعالیٰ کی دنیا والوں پر خصوصی اور بے پایاں رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ گمراہ کرنے والے شیاطین قید میں ڈال دیے جاتے ہیں' جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں' یعنی حصول جنت کو نسبتاً آسان بنا دیا جاتا ہے۔ اللہ کی طرف سے پکار آتی ہے کہ نیکی کے طالب آگے بڑھ اور اس خوشگوار اور سازگار ماحول سے فائدہ اٹھا۔ یعنی پورے آداب کے ساتھ روزے رکھ اور ذوق وشوق اور خلوص کے ساتھ رات کو قیام کر' تاکہ تو اللہ کی مہربانیوں کا حاصل کرنے والا بن جائے۔ اسی طرح برے لوگوں کو آواز دی جاتی ہے کہ برائی سے باز رہیں۔ یہ آواز اگرچہ ہم اپنے کانوں کے ساتھ نہیں سن سکتے مگر ہم اس کی تأثیر تو دیکھتے ہیں کہ رحمتوں کا ماحول نیکوکاروں کو چست اور فعال بنا دیتا ہے' جبکہ بروں کو برائی سے روکتا ہے۔ ہاں وہ لوگ اس ماہ میں بھی برائیاں نہیں چھوڑتے جنہوں نے اپنا باطن اس قدر گندا' غلیظ اور سیاہ کر لیا ہوتا ہے کہ خارجی سازگار ماحول سے بھی وہ کوئی مثبت اثر نہیں لے سکتے۔ ایسے لوگ رمضان شریف میں بھی جرائم کا ارتکاب کرتے' جھوٹ اور فریب سے کام لیتے' ناجائز روزی کماتے' چوریاں کرتے اور ڈاکے ڈالتے ہیں۔ الغرض اُن کے لیے رمضان کا آنا نہ آنا برابر ہوتا ہے۔ ایسے خبیث نفوس رحمتوں بھرے اس مقدس مہینے میں دن کے وقت کھاتے پیتے اور سگریٹ نوشی کرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں رمضان کا احترام بھی نصیب نہیں ہوتا۔

رسول اللہ ﷺ کی پیروی میں نیک لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ رمضان کے سازگار ماحول سے فائدہ اٹھانے کے لیے شعوری طور پر تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ اس مہینے میں زیادہ

سے زیادہ وقت نوافل پڑھنے' ذکر واذکار اور تلاوت کرنے کا پہلے سے ارادہ کر لیتے ہیں' جیسے ایک کسان موسم برسات میں بارش آنے سے پہلے پہلے اپنے کھیتوں کی منڈیریں مضبوط کر لیتا ہے' چنانچہ جب بارش پڑتی ہے تو پانی اس کے کھیت کو بھرپور سیراب کرتا ہے۔ ایسا کسان بارش کے پانی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اسی طرح وہ لوگ جو رمضان کا استقبال چاہت اور آمادگی کے ساتھ کرتے ہیں' رمضان کے آغاز سے ہی بھلائیوں کی جدوجہد تیز کر دیتے ہیں اور پورا مہینہ خوب کمائی کرتے ہیں' ایسے لوگوں کے لیے رمضان شریف بخشش کا باعث بن جاتا ہے۔ بخاری اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ جنت کا ایک دروازہ ''باب الریان'' ہے۔ اس دروازے سے قیامت کے دن صرف روزہ داروں کا داخلہ ہوگا' ان کے سوا کوئی اور اس دروازے سے داخل نہ ہو سکے گا۔ اس دن پکارا جائے گا کہ کدھر ہیں روزہ دار؟ پس وہ اٹھیں گے (اور ادھر چل پڑیں گے) کوئی دوسرا اس دروازے سے نہیں گزر سکے گا۔ پس جب روزہ دار اس دروازے سے جنت میں پہنچ جائیں گے تو یہ دروازہ بند کر دیا جائے گا' پھر کسی کا اس میں داخلہ نہیں ہو سکے گا۔

ظاہر ہے یہ وہی روزہ دار ہیں جن کو روزوں کے ساتھ خصوصی دلچسپی ہے اور وہ پورے آداب کے ساتھ روزے رکھتے ہیں' گناہوں سے بچتے اور اللہ کی رضا کی خاطر بھوک پیاس برداشت کرتے اور رات کو جاگتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے روزے کے مقصد کو پا لیا' ثواب حاصل کیا اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ. آمین!

اِستخلاف فی الارض اور اس کے عملی تقاضے

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے موقع پر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان جو مکالمہ مذکور ہے اس مکالمے سے تین باتوں پر بڑی وضاحت کے ساتھ روشنی پڑتی ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ نے کائنات میں حضرت آدم علیہ السلام کی حیثیت خود ہی متعین فرمادی کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہوں گے۔ اور خلیفہ کا معنی ہی یہ ہے کہ وہ من کل الوجوہ مختار نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ اختیار کے ذریعے اپنے حلقۂ انابت میں منشاءِ الٰہی کی تعمیل اور تکمیل کا ذمہ دار ہوگا۔

(۲) انسان کو مسجود الملائکہ ٹھہرانے میں اس حقیقت کا اظہار ہوا کہ وہ اپنی مخصوص صفات کی بدولت ایک امتیازی شان رکھتا ہے اور انہی صفات کی مزید تربیت کے لیے دنیا کو اس کے لیے دارالعمل اور دارالامتحان بنایا گیا ہے۔

(۳) مثبت رجحانات کے ساتھ ساتھ اس کی فطرت میں بے شمار منفی رجحانات بھی ودیعت ہیں۔ انہی رجحانات میں انگیخت کے ذریعے اس کا اصلی دشمن شیطان اُس کو خدا کا بندہ بننے کی بجائے خدا کا مدّ مقابل اور باغی بنا کر کھڑا کرتا ہے۔ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعے سے اس کی رہنمائی کا انتظام فرمایا اور اسی رہنمائی کے حسن قبول اور بہتر استعمال پر اس کی اصل کامیابی کا انحصار ہے۔

سورۃ البقرۃ کے رکوع سوم سے مستخرجہ بالا نتائج کا مطالعہ یہ سمجھنے کے لیے بالکل کافی اور شافی ہے کہ انسان اس دنیا میں ابتلاء و آزمائش کی زندگی گزار رہا ہے۔ اُس کے مثبت اور منفی رویوں کے ٹکراؤ سے اس کو ایک ہمہ وقتی تصادم کا سامنا ہے۔ یہ تصادم اُس کے اپنے متضاد شخصی رویوں کی وجہ سے خود اُس کے اپنے بدن اور جسم میں بھی، اور اقوام و ملل کے اختلافِ ترجیحات کی وجہ سے پورے کرۂ ارض پر بھی برپا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم:۴۱)

''خشکی اور تری (بحر و بر) میں لوگوں کے (برے) کرتوتوں کی وجہ سے فساد برپا ہو گیا ہے۔''

یہ تصادمِ انسانی دنیا کے لیے بہت بڑے فتنے اور فساد کا موجب ہے۔ اور اگر اس کا راستہ روکنے کے لیے کوئی منصفانہ حل اور مؤثر تدبیر روبعمل نہ آئی تو دنیا لازماً ''یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کرنہ دے برپا'' والی صورت حال سے دوچار ہوگی۔ اس منصفانہ حل کے لیے انسان کا منصبِ خلافت اپنا کام شروع کرتا ہے اور اس تصادم کی رفتار کو اس حد تک کم کر دیتا ہے کہ دنیا رینگ رینگ کر اپنے وقتِ موعود اور اجلِ مسمّیٰ تک پہنچ پائے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۝﴾ (الانشقاق)

''اے انسان! تجھ کو تکلیف سہ سہ کر (کشاں کشاں) اپنے ربّ کی طرف پہنچنا ہے، پھر اُس سے ملاقات کرنی ہے۔''

سطورِ بالا کا خلاصہ یہ نکلا کہ انسان اپنی فطرت اور نہاد سے تصادم پر مجبور ہے جس کی وجہ سے ہر وقت فساد فی الارض کا خطرہ درپیش رہتا ہے۔ خلافت اسے بقائے باہمی کا وہ معتدل راستہ دکھاتی ہے کہ جس سے وہ دنیا میں امن و سکون اور آخرت میں درجاتِ عالیہ کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

خلافت کی اس ضروری تشریح اور توضیح کے بعد موضوع کے دوسرے جز یعنی اس کے عملی تقاضوں پر بحث پیش نظر ہے۔ یہ بحث اپنی از حد اہمیت کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ نازک اور حساس بھی ہے اور وقت نے اس کو بڑا غامض اور دقیق بھی بنا دیا ہے۔ بہرحال میں اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس سلسلے کی ضروری گزارشات آپ حضرات کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

جیسے کہ سطور بالا کے بین السطور سے یہ بات طشت از بام ہوگئی ہے کہ بندگیٔ ربّ کے لیے سازگار میدانِ حیات خلافت اور اس کی برکات کے بغیر تقریباً ناممکن ہے، جس

سے منطقی طور پر خود بخود یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ نظامِ خلافت کا قیام نہ صرف ایک شرعی فریضہ ہے' جیسے کہ اہل سنت کا موقف ہے' بلکہ یہ اس کی ایک ناگزیر عقلی ضرورت بھی ہے' جیسے کہ معتزلہ کی رائے ہے۔ یعنی اہل اعتزال اور اہل سنت کے درمیان خلافت کے بارے میں یہ جھگڑا کہ یہ ایک شرعی فریضہ ہے یا عقلی ضرورت' کوئی خاص معنی نہیں رکھتا' کیونکہ شریعت وعقلیت یا بالفاظِ دیگر عقل ونقل میں تقابل اور تضاد ہی کب ہے کہ ایک کو ماننے سے دوسرے کی تردید لازم آئے! چنانچہ خلافت کے بارے میں عقلِ صریح کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ وہ واجب اور لابدی ہے اور نقلِ صحیح بھی یہی کہتی ہے کہ انسانی معاشرے کے صحیح اور کامیاب انضباط کے لیے اس سے مفر نہیں۔ یہ انسان کی مطلوبہ زندگی کے لیے اساس کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے بغیر اس مطلوبہ زندگی کا کوئی دوسرا راستہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ چنانچہ بڑی آسانی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ خلافت عقل ونقل دونوں کی رو سے یکساں طور پر واجب اور فرض ہے' لہٰذا لاطائل بحثوں میں الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قیام واستحکامِ خلافت کے لیے سب سے پہلی اور اصلی ضرورت ایک ایسے داعی' پیشوا' رہنما اور لیڈر کی ہے جو مرکزِ خلافت قرار پائے۔ خلافت ایک بہت ہی اہم اور مبارک اجتماع ہے۔ اس اجتماعیت کو سب سے پہلے ایک ایسے نقطۂ اجتماع کی ضرورت ہے جس کی تأثیر سے اس کے تمام اجزاء نہ صرف متأثر بلکہ پوری آمادگی اور انتہائی سرعت وقوت کے ساتھ متحرک ہوں۔ جس طرح دل کی قوت جسم کے تمام اعضاء کی قوتِ کار کی ضامن ہوتی ہے بعینہٖ اسی طرح داعی اور قائد خلافت' جسے کبھی خلیفۃ الرسول کہا جاتا تھا اور اب عرصے سے امیر المؤمنین کہلاتا ہے' اعضائے مملکت کے لیے منبع قوت اور مدارِ کار ہوتا ہے۔ اور جس طرح سے ایک کمزور اور بیمار دل جسم کے دوسرے اعضاء میں زندگی کی لہر دوڑانے کے قابل نہیں ہوتا' جس کی وجہ سے ایک ایک عضو اپنی جگہ پر مرجھانے لگتا ہے' بعینہٖ اسی طرح مسلمانوں کا ایک کمزور اور ضعیف داعی یا خلیفہ اپنی اجتماعیت کے دُور دراز حصوں میں سرگرم عمل کارکنان اور ذمہ داروں کی سستی اور تعطل کا سبب بنتا ہے' اور پھر اس کی پرچھائیاں پوری تحریک اور ادارۂ خلافت پر پڑتی ہیں جس سے ایک عام بددلی اور انتشار کی کیفیت پیدا ہوتی ہے' جس کے نتیجے میں حوصلے اور جذبات اس قدر متأثر ہو جاتے ہیں کہ ان کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے۔ ایک عربی مقولہ میں اس صورت حال کی بہت اچھی ترجمانی کی گئی ہے کہ ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ'' یعنی عام لوگ اپنے قائدین اور بادشاہوں کے طور طریقوں پر ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں بنواُمیہ کی تاریخ کا ایک بہت مشہور تجربہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشہور اُموی حکمران ولید بن عبدالملک محلات وتعمیرات کا بڑا شوقین تھا۔ چنانچہ اس کے دَورِ حکومت میں کوئی بھی دو آدمی آپس میں ملتے اور گفتگو شروع کرتے تو عام طور پر دلچسپی کا موضوع تعمیرات ہی ہوتیں اور ایک دوسرے سے اس کے گھر' حجرے اور چوپالوں کے ڈیزائن' وسعت اور نقش ونگار کے بارے میں بات ہوتی۔ اس کے بعد اُس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک خلیفہ بنا تو چونکہ اسے عورتیں بہت زیادہ پسند تھیں لہٰذا رعایا میں بھی اکثر وبیشتر اسی موضوع پر باتیں ہوتیں' مثلاً تم نے کتنی شادیاں کی ہیں' کس خاندان اور گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور اُن کے حسن وجمال اور سلیقہ مندی کا کیا حال ہے۔ سلیمان کے بعد عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو چونکہ وہ خود ایک زاہد اور عابد حکمران تھے چنانچہ اسی کے زیر اثر عوام الناس میں بھی زہد وعبادت کا ذوق ابھرنے لگا اور عام طور پر نمازوں' اذکار ووظائف اور دوسرے دینی اعمال کا ذکر ومذاکرہ ہوتا۔ الغرض انسانی نفسیات اور تاریخی تجربات دونوں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ داعی اور قائدِ خلافت کی زندگی کا ایک ایک طور اور اس کی ایک ایک ادا وابستگان کی مختلف مزاجی کیفیات کے لحاظ سے کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ ان کی زندگیوں اور سیرت وکردار میں بھی پوری طرح سے عیاں اور نمایاں ہوتی ہے۔

مسئلہ قیامِ خلافت کے لیے تحریکِ خلافت کا ہو یا بقاء واستحکامِ خلافت کے لیے ادارۂ خلافت کا' دونوں صورتوں میں داعی یا قائدِ خلافت کی حیثیت ایک ریلوے انجن کی سی ہوتی ہے جو اپنے ساتھ وابستہ سواریوں سے بھرے اور ساز وسامان سے لدے پھندے بیسیوں ڈبوں کی نفسِ حرکت اور ان کی سست رفتاری اور تیز رفتاری کا مرکزی محرک ہوتا ہے۔ انجن کی اصل قوت اسٹیم یا تیل کی مرہونِ منت ہوتی ہے' لیکن داعی یا قائد خلافت کی اصل قوت اس کا وہ احساسِ نیابت اور خلافت ہوتا ہے جس کی بدولت اس میں اعلیٰ درجے کی بےنفسی اور بےلوثی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب اس کا ہر فیصلہ واقدام اُس کی کسی بھی ذاتی خواہش کا نتیجہ نہیں ہوتا' بلکہ وہ اپنے ضروری علم اور خداداد فراست سے منشاءِ الٰہی کی صحیح صحیح تشخیص ونشاندہی کے بعد اُس کی تعمیل کے لیے اٹھتا ہے اور پھر تحریک یا ادارۂ خلافت کے ایک ایک رکن میں خلوص وللّٰہیت اور حصولِ مقصد کے لیے جوش وجذبے کی وہ روح بھر دیتا ہے جس سے ان کے اعتماد اور توکل علی اللہ اور قوتِ کار میں ایک مافوق الفطری شان پیدا ہو جاتی ہے' لہٰذا کوئی مخالف قوت ان کی معرکہ آرائیوں کا راستہ نہیں روک سکتی۔ بقول اقبال ؎

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا!

خلافت جتنا کچھ مقدس اور بلند مرتبہ منصب ہے اسی قدر اُس کی تمام ذمہ داریاں اور سرگرمیاں بھی مقدس اور بلند مرتبہ ہیں۔ یہ اوّل تا آخر ایک مسلسل جُہد ومجاہدہ ہے جس کا ہر لمحہ اپنے اندر ایک خاص معنویت رکھتا ہے۔ اس معنویت کا صحیح فہم وشعور اور پھر اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صحیح نقشۂ کار کے مطابق عملی اقدام اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل وکرم اور امداد ومعاونت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کا ہمہ وقتی استحضار لابدی اور ناگزیر ہے۔ یہ استحضار اور نسبت اللہ تعالیٰ سے انتہائی

محبت اور لو لگانے کے بغیر میسر نہیں آتی۔ اس کے لیے مختلف مزاجوں کے حاملین کے لیے اُن کے حسبِ مزاج کمی و بیشی کے ساتھ ایک خاص مدت تک عزلت اور گوشہ نشینی کی ضرورت ہوتی ہے‘ تاکہ اُس کی توجہ میں کمالِ یکسوئی اور جذبۂ محبت میں اس حد تک پختگی پیدا ہو کہ تحریک خلافت یا کارِ خلافت کی ہنگامہ آرائیوں میں اُس کا ذہن آسانی سے انتشار اور پراگندگی کا شکار نہ ہو جو اُس کے مقصد کے لیے زہرِ قاتل سے کم نہیں۔

یہ عزلت اور گوشہ نشینی تعطّل یا رہبانیت ہرگز نہیں‘ بلکہ یہ خود شناسی اور خود آگاہی کی تحصیل کے لیے وہ ضروری مشق و تمرین ہے جس کے بغیر بڑی بڑی مہمات میں اپنے حواس پر قابو پانا عادتاً ناممکن ہوتا ہے۔ اقبال مرحوم یہی نکتہ سمجھا رہے ہیں :ے

وحشت نہ سمجھ اس کو اے مردکِ میدانی
کہسار کی خلوت ہے تعلیمِ خود آگاہی!

یہ گوشہ گیری اس لیے نہیں ہوتی کہ آدمی اس کو زندگی کا وظیفہ بنالے‘ بلکہ یہ ایک مخصوص وقت کے لیے محض اس لیے ہوتی ہے کہ اس سے انسان کو مناجاتِ الٰہی اور گریہ وزاری کا ذوق اور اس کی حلاوت نصیب ہو جو کل کلاں تحریک یا کارِ خلافت کے سخت ترین مراحل میں بھی اپنے ربّ سے اس کا رابطہ منقطع نہیں ہونے دیتی۔ چنانچہ وہ ہر لمحہ اللہ تعالیٰ سے تازہ بتازہ فرحت اور توانائی حاصل کرتا رہتا ہے اور دون ہمتی اور سہل انگاری سے مأمون اور مصئون رہتا ہے۔

ہم سب کا یقین و ایمان ہے کہ تحریک اسلامی کے قائد اوّل محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی امتیازی خصوصیات سے نوازا تھا۔ وہ انسانی صلاحیتوں کا ایک شاہکار نمونہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کامل و مکمل انسان کو بھی میدانِ عمل میں آنے سے پہلے غارِ حرا کی خلوتوں سے گزارا۔ اس کا سوائے اس کے اور کیا مطلب ہوسکتا ہے کہ فطری صلاحیتوں کا یہ شاہکار نمونہ بھی کسی درجے میں اس کا محتاج تھا کہ صحرائی گوشہ گیری سے وہ صلابت اور پختگی حاصل کرلے جو قیادت اور پیشوائی کی صبر آزما اور جاں گسل وادیوں میں طوفانوں کا سامنا کرتے وقت اُس کو کسی بھی دوسری جانب بھٹکنے سے بچائے رکھے‘ اور کامیابی کی جانب ناک کی سیدھ میں آگے بڑھتے ہوئے کوئی بڑے سے بڑا پتھر بھی اُس کو راستہ تبدیل کرنے پر آمادہ نہ کرسکے۔

سوچیے‘ اور خوب سوچیے‘ کہ اگر صورتِ حال یہی ہے‘ اور یقیناً یہی ہے‘ کہ پیغمبر ﷺ کی تربیت میں بھی عزلت و گوشہ نشینی کو دخل تھا——— ورنہ تو غارِ حراء کی خلوتیں العیاذ باللہ کارِ فضول اور عبث تھیں‘ جبکہ انبیاء صلوات اللہ علیہم اجمعین کے اوقات میں عبثیات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی——— تو پھر ماوشما کس قطار اور شمار میں ہیں کہ تربیت کے اِن مراحل سے گزرے بغیر قیادت کی ہوس میں مبتلا ہوں! بقول اقبال مرحوم :ے

پہلے خوددار تو مانندِ سکندر ہو لے
پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر!

میں تو اپنے طور پر یہی سمجھتا ہوں‘ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال‘ کہ زوالِ خلافت کا سبب بھی قیادتوں کا یہی عیب رہا اور آج حصولِ خلافت کی راہ بھی اگر کھوٹی ہے تو اس کا سب سے بڑا سبب بھی یہی ہے۔ تحریک خلافت اور ادارۂ خلافت کی ذمہ داریاں تو بڑی چیز ہیں‘ اس سے بہت کم درجے کی ذمہ داریاں بھی ایسے افراد کی راہیں تک رہی ہیں جو ضروری امانت و دیانت کے ساتھ آگے بڑھ کر اُن کو نباہ سکیں۔ ہر طرف ''اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ'' اور ''زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن'' کا سماں ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ حساس‘ ذمہ دار اور امانت دار قیادت کا فقدان قومی اور ملی طور پر ہمارا سب سے بڑا نقصان اور کمی ہے اور عظیم ترین اور مہلک ترین مرض ہے۔ جب تک اس مرض کی بنیادوں پر تیشہ چلا کر ہماری قومی زندگی میں پیوست اس کے ایک ایک ریشے کو نہیں اکھاڑ پھینکا جاتا ہمارا قافلہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے :ے

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است ہنوز ایں کارواں دُور از مقام است
زِکارِ بے نظامِ او چہ گویم تو می دانی کہ ملت بے امام است!

اب ملت کی بے امامی کو دور کرنے کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ کسی کو بطور علامت (Symbol) امام بنا بٹھایا جائے‘ بلکہ امام وہ ہو جو اپنی اہلیتِ امامت کو اپنے عمل اور کردار سے خود ثابت کر دکھائے اور اس کی امامت اس درجہ واقعی اور حقیقی ہو کہ کوئی باضمیر انسان اُس کی حق پرستی کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ مسلمانوں کی امارت اور امامت کا منصب عرصۂ دراز سے بنجر اور غیر آباد ہے اور اقبال کے الفاظ میں کسی ایسی شخصیت کا منتظر ہے جو حاضر و موجود کے بجائے غائب و موعود پر ایمان رکھے :ے

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے!

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا خطاب حضرت داؤد علیہ السلام سے یوں منقول ہے:

﴿یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ (صٓ:۲۶)

''اے داؤد! یقیناً ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ مقرر کیا ہے' پس تم لوگوں کے مابین حق کے ساتھ فیصلہ کرو!''

حضرت داؤد علیہ السلام اپنے وقت کے خلیفۂ برحق تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو خلافت کی تمام ذمہ داریوں کو نبھانے کا بتاکید حکم فرمایا۔ اور اس کے لیے فقط ایک جملے میں یعنی ﴿فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ وہ جامع تعبیر فرما دی جو خلافت کی تمام چھوٹی بڑی ذمہ داریوں پر حاوی ہے۔ اگر حکم بالحق کی ترویج اور ہر طرف اس کا دور دورہ ہو جائے تو یہ دنیا جو ابھی جہنم زار بنی ہوئی ہے' لمحوں کے اندر جنت نشان بن جائے اور ہر طرف امن و امان اور خوشحالی کا سماں بندھ جائے۔

سیادت و قیادت کی تجزیہ کاری پر اس دراز نفسی کا یہ مطلب ہرگز نہ لیجیے گا کہ استخلاف فی الارض کے سلسلے میں یہی واحد اور اکیلا عملی تقاضا ہے اور اس کے بغیر کچھ نہیں۔ نہیں' ایسا ہرگز نہیں اور نہ ہی فقط یہی ہمارا منشا ہے۔ اس دراز نفسی کی غرض و غایت یہ ہے کہ استخلاف فی الارض کی سرگرمیوں میں قیادت و مرکزیت کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم اور مرکزی مسئلہ ہے۔ اس کا عمدہ اور صالح نمونہ پیدا کیے بغیر خلافت کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ سیادت و قیادت کی صلاحیتیں وہبی بھی ہیں اور کسبی بھی۔ وہبی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کے تزکیے اور تربیت کی مطلق ضرورت نہیں' ورنہ کم از کم انبیائے کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین کو اس کی کوئی ضرورت نہ ہوتی' حالانکہ نبی علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ کوئی نبی نہیں گزرا ہے جس نے شبانی نہ کی ہو اور میں نے بھی اہل مکہ کی بھیڑ بکریاں چرائی ہیں۔ اور اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ کوئی انسان اس کی ابتدائی صلاحیت سے بالکل خالی بھی ہو سکتا ہے۔ نہیں' کوئی بھی سالم الخلقت انسان اس سے محروم نہیں۔ وہبی اور کسبی کی تقسیم کا صرف یہ مطلب ہے کہ بالفعل قابل اعتماد صلاحیتیں کسی کسی کو بخشی جاتی ہیں جن پر تھوڑی سی اکتسابی محنت کر کے انہیں فعال بنایا جا سکتا ہے۔ اور عام لوگوں میں اس کے ابتدائی جرثومے ودیعت ضرور ہیں لیکن ان کی نشوونما کے لیے خاص توجہ اور قدرے زیادہ محنت و مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہرحال یہ بات آج کے دَور میں بالخصوص قابلِ توجہ ہے کہ قیادت کے فقدان نے ہمیں خلافتِ ارضی کی عظیم نعمت سے محروم رکھا ہے اور اہل قیادت کا پیدا ہونا کوئی ایسی انہونی بات نہیں کہ ہم ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہیں اور اپنی تقدیر اور قسمت کو کوستے رہیں۔ تقدیر اور قسمت انسان کے اپنے اعمال اور سیرت و کردار کا عکس ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کی روشنی میں مرتب ہو کر اُس کے گلے کا ہار بنایا گیا ہے' اُس کے اپنے اعمال و کردار سے ماوراء کوئی جبری طور پر ٹھونسا ہوا فیصلہ ہرگز نہیں۔ بقول اقبال: ؎

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں!

﴿وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾﴾ (بنی اسراء یل)

''اور ہر انسان کا شگون ہم نے اُس کے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے' اور قیامت کے روز ہم ایک نوشتہ اس کے لیے نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب کی طرح پائے گا۔''

خدا ترسی' اپنے مقصد سے عشق کی حد تک دلی لگاؤ اور گرمجوشی کے علاوہ امام و رہنما کے لیے جسمانی صحت اور وقت کے مطابق ضروری علم اور خبرداری بھی ضروری ہے۔ بنی اسرائیل نے حضرت طالوت کی سپہ سالاری اور بادشاہی پر اعتراض کیا تو وقت کے نبی نے امیر کی ضروری صفات کے سلسلۂ ذکر میں یہ فرما کر ﴿وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۴۷) ''اور اللہ نے اس کو زیادہ فراخی دی ہے علم اور جسم میں'' اُن کا مُنہ بند کر دیا۔ ''بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ'' سے مراد یہ ہے کہ وہ جسمانی طور پر قابل لحاظ تنومندی اور سلامتِ اعضاء کا حامل ہو اور قیادت کے تقاضوں اور اُس کی ضروریات کا ضروری علم رکھتا ہو اور اس کے استعمال کا سلیقہ بھی جانتا ہو۔ یہ چیزیں قیادت کی لازمی صفات یعنی دیانت و امانت کے بعد ترجیحی وجوہ کے ذیل میں آ سکتی ہیں' لیکن اس کا بلند سے بلند درجہ بھی اخلاص و احساسِ فرض اور للّٰہیت کا بدل ہرگز نہیں بنتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اخلاص و للّٰہیت وہ بنیادی قدر ہے جس کی کمی وزیروں اور مشیروں سے ہرگز پوری نہیں کی جا سکتی' جبکہ باقی ساری ترجیحی صفات کا مختلف طریقوں سے مداوا ہو سکتا ہے۔ آپ ہمارے مغرب گزیدہ صدر کے ساتھ خواہ مستند اور خدا ترس علماء کا ایک پورا دستہ بھی بٹھا دیں' لیکن جب تک ان کے اندر نام نہاد روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے جراثیم موجود ہیں تو نہ صرف یہ کہ اُن کی اصلاح کی کوئی اُمید نہیں کی جا سکتی بلکہ اُلٹا ہمارے علماء میں ان جراثیم کے سرایت کیے جانے کا خطرہ لاحق ہوگا۔ اس کے بجائے ایک لولا لنگڑا صدر اور حکمران بھی' جو امانت اور دیانت کی خوبیوں سے آراستہ ہو' حالات سے خبردار اور واقف کار وزیروں اور مشیروں کی مدد سے ایک کامیاب سربراہ کار ثابت ہو سکتا ہے۔

آپ سب بخوبی جانتے ہیں کہ انسانی معاشرہ اور اجتماع ایک مشین کی مانند ہے جس کا ہر پُرزہ مشین کی مجموعی کارکردگی میں اپنی ایک اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طریقے سے تحریک خلافت یا ادارۂ خلافت کا ہر رکن اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بقول اقبال: ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا

یہ اصحابِ رسول ﷺ کا مؤثر رول تھا کہ تیئیس سال کی مختصر مدت میں اسلامی انقلاب جزیرۂ عرب کی حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچا اور نبی اکرم علیہ السلام کی وفات کے بعد تو خالص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی تھے جنہوں نے دنیا کے ایک طویل وعریض رقبے پر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام نافذ کر کے دکھایا۔ ایسے ہی سرفروشوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ :

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ﴾ (الفتح:۲۹)

''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں' اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں تو رکوع وسجود' اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔''

یہ قرآنی اعزاز ببانگ دہل پکارتا ہے کہ جس طرح سے نبی علیہ السلام نے نبوت کے آغازِ کار میں اپنے موقف کے مخالفین سے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا بعینہٖ اسی طرح تا آخرِ امر خود نبی علیہ السلام نے بھی' اور اُن کے رفقائے کار صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے بھی کفر کے مقابلے میں کسی روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا' بلکہ اپنے موقف کے ایک ایک مظہر پر ڈٹے رہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے موقف کو غلبہ عطا فرمایا اور اس عزم وہمت کے بدلے میں رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کا انعام واکرام بھی ملا۔ آج بھی اگر خلافت قائم یا باقی رہ سکتی ہے تو اسی طرح سے کہ اسلام کی بالادستی پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے' اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی ثقافت اور کلچر کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مظہر سے بھی دستبرداری قبول نہ کی جائے۔ ﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ﴾ (آل عمران:۱۴۰) ''اور یہ تو زمانے کے نشیب وفراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں''۔ کے بموجب قوموں پر زوال وعروج کے مختلف حالات آتے رہتے ہیں لیکن وہ اپنے تشخص کو کسی حال میں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ بڑوں کی استقامت ہی اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت کی جالب ہوتی ہے اور اسی سے فتح اور کامرانی کے بند راستے رفتہ رفتہ وا ہونے لگتے ہیں: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝﴾ (محمد) ''اگر تم نے اللہ کی مدد کی (یعنی اس کے دین کو قائم ونافذ کرنے کی جدوجہد کی) تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدمی عطا کرے گا''۔ بقول شاعر:

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لَا تَخَفْ

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝﴾ (الرعد) کے بموجب اللہ تعالیٰ وعدے کی خلاف ورزی ہرگز نہیں فرماتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ: ﴿اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ﴾ (آل عمران:۱۳۹) ''تم ہی سربلند ہو گے'' تو اس پر اعتماد کرنے میں کسی شک وشبہ کا موقع ہرگز نہیں' بس صرف اتنی دیر ہے کہ ہم ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾ کی شرط پوری کریں کہ ''اگر تم (حقیقی) مؤمن ہو''۔ بعض اچھے خاصے لوگ بھی بڑی حیرت کے ساتھ پوچھتے ہیں کہ مسلمان بدعمل سہی لیکن کفار سے تو اچھے ہیں' پھر کفار کے مقابلے میں ان کو کامیابی کیوں نہیں ہوتی؟ قرآن وحدیث کا مطالعہ کرنے والا کوئی آدمی اس حیرت کا شکار ہو تو اس پر تعجب بالائے تعجب ہے۔ خلافت بین الانسانی معاملات وتعلقات کی وہ بنیاد فراہم کرتی ہے جو خدائی عدل وانصاف کا مظہر ہو۔ اگر ملت اسلامیہ کی موجودہ زبوں حالی کے باوجود اللہ تعالیٰ محض اس وجہ سے مسلمانوں کو خلافت قائم کرنے دے کہ یہ کفار سے محض فکری یعنی عقیدے کے اعتبار سے تو اچھے ہیں اگرچہ دنیا جہان کی عملی خرابیوں کا مجسمہ ہیں' تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ دنیا کے موجودہ جاہلانہ اور ظالمانہ نظام سے بھی بدتر نظام کی وکالت کرے اور مخلوقِ خدا کو آج کی مشکلات سے بھی بڑھ کر مشکلات وشدائد میں مبتلا کرے۔ کیا ہم اللہ تعالیٰ سے یہی توقع رکھیں؟ العیاذ باللہ' ثم العیاذ باللہ' اللہ تعالیٰ تمام انسانیت کا بلاامتیاز خالق اور ربّ ہے۔ اس دنیا کو اُس نے عالم اسباب بنایا ہے۔ یہاں غلبے اور اقتدار تک رسائی کے لیے اپنے مناسب اسباب ہیں۔ ان اسباب میں بعض علمی وفکری' بعض اخلاقی اور بعض مادی ہیں۔ ان سب کے مجموعے پر غلبہ کا ترتب ہوتا ہے۔ ان میں سے کون سا سبب اس غلبے میں کس حد تک مؤثر اور دخیل ہے' اس کو معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی پیمانہ اور ترازو نہیں ہے۔ اگر آج کے دور کے کفار نے ان اسباب کا ایک بڑا حصہ فراہم کر دیا ہے اور ہم ان سے محروم ہیں تو ظاہر ہے کہ اس دنیا میں قوموں کے زوال وعروج کے جو قدرتی ضابطے ہیں اُن کے موافق غلبہ اور اقتدار اُن کی جھولی میں پڑے گا ہماری جھولی میں ہرگز نہیں۔ بقول اقبال: ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل ' طاؤس و رباب آخر!

اس دنیا میں عدلِ الٰہی کے جو اسالیب ہیں کفار کا موجودہ غلبہ انہی کا تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے لیے بھی اپنے عدل کے ضابطے اور سنن کو تبدیل نہیں کرتا:

﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿٤٣﴾﴾ (فاطر)

''پس تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم اللہ کے طریقے کو (اس کے مقرر راستے سے) کبھی پھرا ہوا نہ پاؤ گے''۔

اگر ہم نے ایمان اور عمل صالح کی بنیاد پر خلافت کا استحقاق پیدا کیا تو ہمارے سروں پر خلافت کا تاج سجنے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا بایں الفاظ وعدہ فرمایا ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص﴾ (النور:۵۵)

''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ اُن کو لازماً اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے''۔

مگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کی امامت میں کوئی حصہ نہیں۔ بقول اقبال :

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر
یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

یہ مردانہ ہمت و عمل کا راستہ ہے۔ آپ خدا کا نام لے کر اٹھیں گے اور منزل کی جانب قدم بڑھانا شروع کریں گے تو کائنات کی ہر چیز کو اپنا رفیق اور مددگار پائیں گے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

ویسے مؤمنانہ عزم از خود وہ جوہر ہے جو اپنی تأثیر کے لیے کچھ بہت زیادہ لمبے چوڑے اسباب کا محتاج نہیں۔

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

میرے معزز سامعین میری ان باتوں کو محض شاعری نہ سمجھیں۔ یہ بہت گہرے احساسات ہیں جو بہت سوچ و بچار اور تاریخی تجربات کے نتیجے میں برآمد ہوئے ہیں۔ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے طالبان کا منصۂ شہود پر نمودار ہونا اور خلافت اسلامی کی ایک جھلک دکھانا ان باتوں کے لیے بہت بڑا شاہدِ عدل ہے۔ امیر المؤمنین ملا عمر میں خلوص کا نور چمکا تو ہر طرف سے نظامِ خلافت کے پروانوں کا ہجوم ہوا اور کسی خاص منصوبہ بندی کے بغیر دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان کے اجڈ اور سرکش افغانی اُن کے لیے مسخر ہوتے گئے' تا آنکہ بہت تھوڑے عرصے میں ابتدائی خلافت کا ایک دلکش نمونہ سامنے آیا۔ اور اگر خود ملت اسلامیہ کے افغانی اور پاکستانی غداروں نے ہی ان کی پیٹھ میں چھرا نہ گھونپا ہوتا تو دنیا کی سپر طاقت کے لیے اس مختصر سی اور بے سروسامان جمعیت کو منتشر کرنا آسان نہیں تھا۔ لیکن واحسرتا! اس ملت اسلامیہ کا ہمیشہ سے یہ المیہ رہا ہے کہ

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ ہر چہ کرد با ما خویش کردم

اور:

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی!

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک دنیائے اسلامی کے خواص اور ایک بڑے حصۂ عوام میں ان کے دینی اور اخلاقی فرائض و وظائف کا احساس اُجاگر اور شعور بیدار نہیں کیا جاتا اور اُن کو اس پر عملاً کاربند نہیں بنایا جاتا عالمی خلافت اسلامی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ اس آگاہی اور بیداری کے لیے داخلی ذرائع دعوت و تربیت بھی کارگر ہیں' لیکن شاید اس سے بڑھ کر کارگر آج کل کفر و ضلالت کا وہ ظلم و ستم بھی ہے جو اَب برداشت کی آخری حدوں سے اُچھل اُچھل کر نکل رہا ہے اور جس سے مسلمانوں کے اندر ایک بہت بڑے پیمانے پر احساسِ تذلیل پیدا ہو رہا ہے۔ اور اب اس تذلیل کا راستہ روکنے کے لیے مسلمانوں کی نئی نسلوں میں ایک ناقابل بیان اور ناقابل یقین بے پناہ جذبہ ابھر رہا ہے جس کی وجہ سے مستقبل کے نقشوں میں نئی رنگ آمیزی کا سامان پیدا ہو رہا ہے۔ اور: ؎

''مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی''

والی بات صادق آ رہی ہے۔

یہاں اکثر و بیشتر سامعین چونکہ خطباء اور مدرسین کے حلقوں سے متعلق ہیں جو اپنے اپنے حلقوں کے قدرتی قائدین ہیں' لہٰذا اگر یہ لوگ اپنے اپنے متعلقین و وابستگان میں استخلاف فی الارض کے حوالے سے ان کی ذمہ داریوں کا احساس اجاگر کرنے کی محنت شروع کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی مساعی بارآور نہ ہوں۔ سب سے بڑی کمی جو میں خود اپنے آپ میں بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں اور دوسرے ابنائے جنس میں بھی دیکھ رہا ہوں' وہ ضرورتِ خلافت کے گہرے اور عمیق احساس کا فقدان ہے۔ علمی مجالس میں اس پر تبصرے کرنا الگ بات ہے اور اپنی ترجیحات میں اس کو اوّلیت دینا بالکل الگ بات ہے۔ اگر خود ہمارے اندر حصولِ خلافت کا ایک چبھتا ہوا احساس زندہ اور متحرک ہو جائے تو یہ احساس دوسروں میں پیدا کرنا چنداں مشکل نہیں۔ بقول اقبال مرحوم :؎

بیا تا کارِ ایں اُمت بسازیم قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجد شہر! کہ دل در سینۂ ملّا گدازیم!

(یہ مقالہ خلافت کانفرنس میں پڑھا گیا)

حدود آرڈی ننس اور مجوزہ حکومتی ترامیم

امکانات، خدشات اور مضمرات

حافظ محمد آصف احسان

اس حقیقت سے ہر صاحب فہم وذکا لازمی طور پر اتفاق کرے گا کہ اخلاقی بے راہ روی اور مادر پدر آزادی حضرت انسان کو ''اشرف المخلوقات'' کے رتبۂ عالی شان سے گرا کر عقل و شعور سے عاری حیوانات کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں اور انسان کی سماجی زندگی کے ان گونا گوں محاسن ومحامد کو پیوندِ خاک کر دیتی ہیں جو جملہ بشریت کا اندوختۂ گراں مایہ اور اثاثۂ بے مثل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام جو ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، نے انسانی معاشرے میں عریانی وفحاشی کے فروغ کی سخت مذمت کی ہے اور ان امور ومعاملات کو مکمل طور پر حرام قرار دیا ہے جو انسانیت کی معراج یعنی شرم وحیا کے منافی ہوں۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۙ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۹﴾﴾ (النور)

''جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ایمان والوں میں فحاشی و بے حیائی پھیلے ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہے۔ اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔''

خالق کائنات کی جانب سے اس قدر شدید تنبیہہ کے باوجود یہ امر انتہائی اذیت رساں اور تأسف انگیز ہے کہ موجودہ ''پرویزی'' حکومت حدود آرڈی ننس میں ترامیم کے ذریعے زنا بالرضا (fornication) کو قانونی تحفظ فراہم کرنے کے درپے ہے۔ اربابِ بست و کشاد اور اصحابِ حل وعقد اس بات کے آرزومند ہیں کہ باہمی رضامندی سے کی جانے والی زنا کاری کو ہر طرح کے ریاستی قوانین سے بالاتر قرار دے دیا جائے اور اس اہانت آمیز اور

09 huddoood

شرمناک فعل کا ارتکاب کرنے والے ''جانوروں'' پر کوئی شرعی حد نافذ نہ کی جائے۔ ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اِس وقت پورے عالم اسلام میں صرف تین ملک (ایران' پاکستان اور سعودی عرب) ایسے ہیں جہاں زنا بالرضا قانونی طور پر جرم ہے۔ان کے علاوہ پورے ربع مسکون میں کہیں بھی رضامندانہ بدکاری کو قانونی طور پر جرم اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو مستوجب سزا نہیں سمجھا جاتا۔ پاکستان میں بھی حدود قوانین کے نفاذ (۱۰ فروری ۱۹۷۹ء) سے قبل زنا بالرضا آئینی اور قانونی طور پر جرم کے زمرے سے خارج تھا' تاہم اس کے نفاذ کے بعد زنا بالرضا کی دستوری حیثیت متعین ہوئی اور اسلام کے نظامِ حدود کے تحت اسے قانونی طور پر جرم قرار دیا گیا۔ چونکہ قیامِ پاکستان کا سب سے عظیم اور نمایاں مقصد ایک ایسے خطۂ زمین کا حصول تھا جہاں شریعت اسلامیہ کے تمام اصول وضوابط اور قواعد وقوانین کو جملہ شعبہ ہائے حیات میں بدرجۂ اَتم نافذ کیا جا سکے' اس لیے وطن عزیز میں حدود آرڈی ننس کی تنفیذ بجا طور پر ایک حوصلہ افزا اور خوش آئند امر تھا' مگر اسے پاکستانی عوام کی تیرہ بختی اور سوختہ نصیبی ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ وقتاً فوقتاً حدود اللہ کو' معاذ اللہ' بازیچۂ اطفال سمجھنے والے حکومتی گماشتوں' نام نہاد مذہبی سکالروں اور مغربی تہذیب وثقافت کے بے نام ونسب علمبرداروں کے پیٹ میں حدود قوانین کے خلاف مروڑ اٹھتے رہے۔انہوں نے مختلف ابلیسی تاویلوں اور شیطانی ہتھکنڈوں کی آڑ لے کر حدود آرڈی ننس کو اسلام کے خلاف' عصری تہذیب وتمدن کے خلاف' انسانی حقوق کے خلاف اور تحفظ نسواں کے خلاف باور کرانا چاہا اور پیہم اسی تگ و تاز میں منہمک رہے کہ یا تو حدود قوانین کو مکمل طور پر منسوخ کر دیا جائے یا پھر اس میں ایسی ترامیم کر دی جائیں جو عملی طور پر اسے عضو معطل بنا دیں۔ تاہم اس سعیٔ نامشکور کے باوجود یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور گردشِ ایام کے ایک معمولی دور کے بعد آج پھر پاکستانی عوام اسی معرکۂ خیر وشر کا سامنا کر رہے ہیں۔

یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسانی معاشرے کی بقاء وسلامتی کا انحصار جن اجزاء وعناصر پر ہوتا ہے ان میں سے اہم ترین عنصر خاندانی نظام کا استحکام ہے۔ اگر یہ نظام

مضبوط اور محکم بنیادوں پر استوار ہوگا تو انسانی معاشرہ بھی بحیثیت مجموعی درست راستے پر گامزن رہے گا اور اس کے افکار ونظریات اور رسوم ورواج کی انفرادیت و یگانگت برقرار رہے گی، لیکن اگر اس نظام میں کجی اور مسلّمہ معاشرتی اقدار وروایات سے انحراف کے عناصر موجود ہوئے تو اس کے تباہ کن اور ضرر رساں اثرات پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے اور ایسا معاشرہ قوانینِ فطرت سے اعراض کرنے کی پاداش میں جلد یا بدیر خودکشی کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ خاندانی نظام کی درستی یا بگاڑ میں خاوند اور بیوی کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر زوجین کے مابین نکاح کی صورت میں مہر و وفا اور صدق و صفا کے احساسات وجذبات موجود ہوں تو لامحالہ اس کے خوشگوار اور نفع بخش اثرات ان کی اولاد پر بالخصوص اور تمام افرادِ معاشرہ پر بالعموم مرتب ہوتے ہیں۔ اور اگر مَرد وزن کے مابین نکاح کا مضبوط اور مقدس رشتہ موجود نہ ہو اور ان کے باہمی تعلقات و روابط محض جنسی آسودگی اور شہوانی لذت حاصل کرنے تک محدود ہوں تو بلاشک وشبہ یہ اقدام نہ صرف متولد ہونے والی اولاد کو باپ کی کمال درجہ شفقت اور ماں کی لائق قدر ممتا سے محروم کر دیتا ہے بلکہ من حیث المجموع پوری سوسائٹی کے لیے ایسے توہین آمیز، رسوا کن اور سنگین نتائج وعواقب کا باعث بنتا ہے جو افرادِ معاشرہ کی ہر موجود صفت (attribute) کو معدوم کر دیتے ہیں۔ خاندانی نظام کی بربادی، معاشرتی زندگی کی تباہی اور قلبی اطمینان وسکون کی عدم موجودگی کا یہ وہ اندوہناک اور عبرت انگیز پہلو ہے جس کا تجربہ ومشاہدہ آج مغربی ممالک کی اکثریت کر رہی ہے۔ یہاں امریکہ اور یورپ میں خاندانی نظام کی زبوں حالی کا مفصل تجزیہ کرنا ہمارا مقصود نہیں، تاہم ''مشت نمونہ از خروارے'' کے مصداق چند چشم کشا حقائق نذرِ قارئین ہیں۔

ایک حالیہ سروے کے مطابق مغربی ممالک میں بسنے والے مرد اپنی زندگی میں اوسطاً ۱۴.۶ عورتوں سے بدکاری کرتے ہیں جبکہ وہاں سکونت پذیر ہر عورت اوسطاً ۱۱.۵ مَردوں سے ناجائز جنسی تعلقات قائم کرتی ہے۔ ۱۹۵۹ء میں برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن کی جانب سے شائع شدہ ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ برطانیہ میں ہر تیسری عورت شادی سے قبل دوسرے مردوں کے ساتھ ناجائز جنسی تعلقات قائم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر میں ''تہذیب وتمدن کے علمبردار'' برطانیہ میں ہر بیسواں بچہ ''ولد الزنا'' ہوتا ہے۔ یونان میں ''بذریعہ زنا'' پیدا ہونے والے ناجائز بچوں کی شرح ۲ فیصد، سوئٹزرلینڈ میں ۱.۶ فیصد، فرانس میں ۱.۳۰ فیصد، ڈنمارک میں ۴۶.۵ فیصد اور سویڈن میں ۴۸.۲ فیصد ہے۔ ان بچوں کی

اکثریت والدین کے کما حقہٗ التفات اور دھیان سے محروم ہوتی ہے۔ انہیں اخلاقی حدود و قیود اور معاشرتی اقدار و روایات سے آگاہ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا' زندگی بسر کرنے کے مہذب و متمدن اطوار سے باخبر کرنے والا کوئی نہیں ہوتا اور ایسا بھی کوئی نہیں ہوتا جو انہیں اس حقیقت کا شعور بخش سکے کہ عارضی سرور اور وقتی لذت کے لیے کیا جانے والا زنا انسان کو حقیقی مسرت اور دائمی فرحت عطا کرنے سے قاصر ہے' اصل انبساط اور خوشی سے تو وہ لوگ ہمکنار ہوتے ہیں جو اپنی شہوانی آرزوؤں کی تسکین اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے نکاح جیسے اہم فریضے سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ یہ موضوع طویل بحث اور عمیق تفصیل کا متقاضی ہے' مگر ہمیں اس وقت عدم فرصت اور صفحات کی تنگ دامانی کا سامنا ہے۔ بہرحال قصہ کوتاہ یہ کہ والدین کی جانب سے اپنی اولاد کی مناسب تعلیم و تربیت اور پرورش و نگہداشت کے فقدان کی بنا پر آج مغربی ممالک میں بسنے والے افراد کی اکثریت اَن دیکھے مقامات کی راہی اور نامعلوم منزلوں کی جانب محوِ سفر ہے۔ ان میں مختلف قسم کی اخلاقی' روحانی اور سماجی برائیاں جیسے زنا کاری' بادہ کشی' کذب گوئی' اذیت رسانی' فریب دہی' جوابازی' سودخوری' سرقہ زنی اور نجانے کون کون سی سیئات اس طرح سے سرایت کر چکی ہیں کہ الامان والحفیظ۔ اگر ہم ان کی تفصیل بیان کریں گے تو اصل موضوع سے دُور ہٹ جائیں گے۔ پس واضح ہوا کہ محض زنا کاری جیسی ایک برائی سے خاندانی نظام تہہ و بالا ہوا' اس سے پورا معاشرہ درہم برہم ہوا اور اس غم کدۂ رنگ و بو میں بسنے والی ایک قوم کی ایسی داستانِ حیات عالم تخیل سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی کہ جس کا ہر صفحہ تیرہ و تار اور ہر باب غم انگیز ہے۔

اگر حدود قوانین میں مجوزہ ترامیم کا بل خدانخواستہ منظور ہو جاتا ہے اور زنا بالرضا کو وطن مائ لوف میں قانونی تحفظ مل جاتا ہے تو اسلامی جمہوریہ پاکستان ان نام نہاد ''اعتدال پسند'' اور ''روشن خیال'' ممالک کی صف میں تو کھڑا ہو جائے گا جہاں جنسی بے راہ روی کے اعتبار سے انسانوں اور جانوروں میں کوئی خاص فرق نہیں' مگر اس کے بعد خاندانی اور معاشرتی نظام کی جس بربادی و تباہی کا آج مغربی ممالک سامنا کر رہے ہیں ہو بہو اُسی آشفتہ سری' ژولیدہ حالی اور ہلاکت خیزی کا سامنا پاکستانی قوم کو بھی کرنا پڑے گا۔ زنا بالرضا کی چھوٹ ملنے پر پاکستانی معاشرہ ''سیکس فری سوسائٹی'' میں تبدیل ہو جائے گا جہاں عصمت فروشی اور قحبہ گری کا دور دورہ ہوگا۔ جس مذموم فعل کا ارتکاب ابھی تک قانون اور معاشرے کے خوف کی بنا پر سات پردوں کے پیچھے کیا جاتا ہے وہ سرِ عام وقوع پذیر ہوگا اور معاشرے کی

کثیر تعداد قومی غیرت وحمیت کے ان تمام مظاہر ومقتضیات کو نقش ونگارِ طاقِ نسیاں بنا دے گی جو پوری ملتِ اسلامیہ کا سرمایۂ افتخار اور طرۂ امتیاز ہیں: ؎

جس کو خدا کی شرم ہے وہ ہے بزرگِ دین
دنیا کی جس کو شرم ہے مردِ شریف ہے
جس کو کسی کی شرم نہیں اس کو کیا کہوں
فطرت کا وہ رذیل ہے دل کا کثیف ہے

امریکہ اور یورپ کی جس نام نہاد جدت پسندی، روشن خیالی اور ننگ انسانیت تہذیب و ثقافت نے حکومتی ایوانوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے اس کی تباہ کاریاں انہی کو مبارک.....! پاکستانی قوم کو ''تحفظ حقوقِ نسواں'' کے پرکشش اور دلفریب تصور کا جھانسا دے کر راہِ راست سے منحرف نہ کیا جائے۔ پہلے ہی صورتِ حال یہ ہے کہ کیبل نیٹ ورک کے ذریعے اخلاق باختہ اور حیا سوز مناظر پوری قوم کو دکھائے جا رہے ہیں، اکثر تعلیمی اداروں میں مخلوط نظامِ تعلیم رائج ہے اور حکومتی سرپرستی میں مَرد و زن کی مشترکہ میراتھن ریس کا انعقاد ہوتا ہے۔ اِن دگرگوں اور ناگفتہ بہ حالات میں ''زنا بالرضا'' کو قانونی جواز عطا کرنا مسلمانانِ پاکستان کے اخلاقی ومعاشرتی تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے مترادف ہے۔

پس ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومتِ وقت ''وسیع تر قومی مفاد'' کے پیشِ نظر حدود قوانین میں کوئی ایسی ترمیم نہ کرے جو قرآن وحدیث کے خلاف ہو، جس سے اہلِ اسلام کے دینی وملی شعائر کو گزند پہنچنے کا امکان ہو، جو پاکستانی عوام کو اپنے منفرد سماجی افکار ونظریات اور رسوم ورواج سے بیگانہ کر دے۔ اسی میں پوری قوم کی سلامتی اور عافیت کا راز پوشیدہ ہے۔ بقولِ اقبال: ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!

☆☆☆

مُحرّمات (۶)

(حرام اُمور، جن سے بچنا ضروری ہے)

حافظ محمد زبیر

(۴۱) کسی کی سفارش کرنے پر تحفہ لینا

کسی مسلمان بھائی کے لیے سفارش کرنا تاکہ اس کو کوئی نفع حاصل ہو، مستحسن امر ہے اور قرآن وسنت میں اس کی تائید آئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا﴾ (النّساء:۸۵)

''جو کوئی اچھی سفارش کرے گا تو اس کے لیے اس میں سے حصہ ہوگا۔''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے پاس جب کوئی سائل یا ضرورت مند آتا تو آپؐ فرماتے:

((اِشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا)) (۱)

''تم سفارش کرو تاکہ تمہیں اجر دیا جائے۔''

اگر کسی کے عہدے، مقام اور مرتبے کی وجہ سے کسی دوسرے مسلمان بھائی کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہو تو اسے یہ فائدہ ضرور پہنچانا چاہیے۔ لیکن اس میں اتنا خیال ضرور رکھ لیا جائے کہ کسی سفارش کی وجہ سے کسی دوسرے مسلمان بھائی کا حق نہ مارا جائے یا اس پر ظلم نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ اَنْ يَّنْفَعَ اَخَاهُ فَلْيَفْعَلْ)) (۲)

''جو تم میں سے اس بات کی استطاعت رکھتا ہو کہ وہ اپنے بھائی کو فائدہ پہنچا سکے تو وہ ایسا ضرور کرے۔''

لیکن کسی مسلمان بھائی کے لیے سفارش کر کے اس سے ہدیہ وصول کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ شَفَعَ لِاَخِیْهِ بِشَفَاعَةٍ فَاَهْدٰی لَهٗ هَدِیَّةً عَلَیْهَا فَقَبِلَهَا فَقَدْ اَتٰی بَابًا عَظِیْمًا مِنْ اَبْوَابِ الرِّبَا))(۳)

''جس نے اپنے مسلمان بھائی کے لیے سفارش کی' پھر اس نے اُسے اِس پر کوئی تحفہ دیا اور اس (سفارش کرنے والے) نے اس تحفے کو قبول کر لیا تو وہ (سفارش کرنے والا) سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔''

ہمارے سرکاری محکموں میں یہ بیماری بہت عام ہے۔ سرکاری ملازمین اپنے افسروں سے سفارش کروانے کے لیے تحفے اور ہدیے لے کر جاتے ہیں اور وہ انہیں قبول کر لیتے ہیں' جو کہ قطعاً حرام فعل ہے۔ اگرچہ جائز سفارش کروانے میں کوئی حرج نہیں ہے' لیکن چونکہ اس پر تحفے تحائف دینا اور لینا بہت سی خرابیوں کا دروازہ کھول دیتا ہے اس لیے ایسے تحائف کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

(۴۲) مزدور سے کام لے کر اُس کی اجرت نہ دینا

رسول اللہ ﷺ نے اس بات کی تلقین کی ہے کہ مزدور کو اس کی اجرت دینے میں جلدی کرنی چاہیے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَعْطُوا الْاَجِیْرَ اَجْرَهٗ قَبْلَ اَنْ یَّجِفَّ عَرَقُهٗ))(۴)

''مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔''

ہمارے ہاں عام طور پر سرکاری محکموں اور پرائیویٹ سیکٹرز میں ملازمین کے ساتھ اس معاملے میں بہت زیادتی اور استحصال پایا جاتا ہے اور اس کی مختلف صورتیں ہیں:

ا) بعض افراد کسی مخصوص کام کے لیے کسی شخص کو اجرت پر رکھتے ہیں اور اپنی پسند کے مطابق کام نہ ہونے پر مزدور کی اجرت دبا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

ب) بعض افراد یا ادارے اپنے ملازمین کو مکمل اجرت ادا نہیں کرتے' بلکہ اُن کی اجرت کا کچھ حصہ خود ہڑپ کر جاتے ہیں۔ سرکاری محکموں میں یہ خرابی عام ہے۔

ج) بعض افراد اپنے ملازمین سے معاہدے میں طے شدہ وقت سے زائد کام کرواتے ہیں جبکہ اس اضافی مدت کی اجرت نہیں دیتے' یہ بھی اسی استحصال میں داخل ہے۔

د) اسی طرح بعض افراد اپنے ملازمین کو اجرت دیتے وقت تنگ کرتے اور تأخیر سے کام لیتے ہیں' بلاوجہ ان کو حیلے بہانے سے ٹالتے رہتے ہیں اور وہ بے چارے اپنے حق کو

وصول کرنے کی غرض سے کچہری اور عدالت کے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ کسی ملازم کی اجرت میں بلاوجہ تأخیر کرنا قطعاً ناجائز ہے' کیونکہ یہ ایک مسلمان بھائی کو اذیت دینے کے مترادف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((قَالَ اللّٰهُ : ثَلَاثَةٌ اَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ : رَجُلٌ اَعْطٰى بِىْ ثُمَّ غَدَرَ وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَكَلَ ثَمَنَهُ وَرَجُلٌ اسْتَاْجَرَ اَجِيْرًا فَاسْتَوْفٰى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِ اَجْرَهُ)) (۵)

''اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ تین آدمیوں کا مَیں قیامت کے دن دشمن ہوں گا: ایک وہ شخص جس نے میرے نام کی قسم دی پھر اُس کو توڑ دیا' دوسرا وہ آدمی جس نے کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اُس کی قیمت کھالی اور تیسرا وہ آدمی جس نے کسی شخص کو اجرت پر رکھا تو اس سے کام تو پورا لے لیا لیکن اسے اس کی اُجرت نہ دی۔''

(۴۳) اولاد کو عطیہ دینے میں اُن کے مابین عدل نہ کرنا

ہمارے ہاں بعض افراد اپنی زندگی میں ہی اپنے بعض بچوں کو تو کچھ ہدیے اور تحفے دے دیتے ہیں' جبکہ کچھ دوسروں کو اس سے محروم رکھتے ہیں۔ یہ ہدیے اکثر اوقات جائیداد کی صورت میں ہوتے ہیں' لیکن اس کے علاوہ بھی ہوتے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ جب اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کو اپنی زندگی میں کوئی چیز ہبہ کریں تو اس میں عدل سے کام لیتے ہوئے باقی اولاد کو بھی شامل کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو گناہ گار ہوں گے' اور اُن کا یہ فعل ظلم شمار ہو گا۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ان کی والدہ بنتِ رواحہ نے ان کے والد (بشیرؓ) سے مطالبہ کیا کہ وہ مجھے (یعنی نعمان بن بشیرؓ کو) کوئی چیز ہبہ کریں تو میرے والد نے میری والدہ کی درخواست پر مجھے کوئی چیز ہبہ کی۔ میری والدہ نے میرے والد سے کہا کہ آپ اس ہبہ پر اللہ کے رسول ﷺ کو گواہ بنائیں۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ میرے والد صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے آپؐ کی خدمت میں لے گئے' جبکہ میں ان دنوں ابھی بچہ تھا۔ میرے والد نے عرض کی:

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اُمَّ هٰذَا بِنْتَ رَوَاحَةَ اَعْجَبَهَا اَنْ اُشْهِدَكَ عَلَى الَّذِىْ وَهَبْتُ لِابْنِهَا' فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((يَا بَشِيْرُ اَلَكَ وَلَدٌ سِوٰى هٰذَا؟)) قَالَ نَعَمْ' فَقَالَ : ((اَكُلَّهُمْ وَهَبْتَ لَهُ مِثْلَ هٰذَا؟)) قَالَ لَا' قَالَ : ((فَلَا

تُشْهِدُنِیْ اِذًا فَاِنِّیْ لَا اَشْهَدُ عَلٰی جَوْرٍ))[٦]

''اے اللہ کے رسول ﷺ! اس بچے کی ماں بنتِ رواحہ کی خواہش ہے کہ میں نے جو چیز اس کے بیٹے کو ہبہ کی ہے اس پر آپ ؐ کو گواہ بنالوں۔ تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''اے بشیر! کیا اس کے علاوہ بھی تیری کوئی اولاد ہے؟'' تو حضرت بشیرؓ نے کہا: جی ہاں' تو آپ ؐ نے فرمایا: ''کیا ان سب کو تم نے اسی طرح کی چیز ہبہ کی ہے؟'' حضرت بشیرؓ نے کہا: نہیں' آپ ؐ نے فرمایا: ''تب تو تم مجھے اس واقعے پر گواہ نہ بناؤ' میں ظلم پر گواہی نہیں دے سکتا۔''

اللہ کے رسول ﷺ نے اولاد میں مال کی ایسی تقسیم سے منع فرمایا ہے تو اس میں ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ اگر والدین کسی بچے کو اپنی زندگی میں زیادہ نوازتے ہیں تو لازمی بات ہے کہ جو اولاد محروم ہوگی اس کے دل میں اپنے والدین کے خلاف عداوت اور نفرت پیدا ہوگی۔ اسی لیے ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ ؐ نے مذکورہ صحابیؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

((اَیَسُرُّکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا اِلَیْکَ فِی الْبِرِّ سَوَاءً؟))قَالَ بَلٰی' قَالَ: ((فَلَا(اِذًا))

''کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ وہ سب ہی تیرے ساتھ حسن سلوک کریں؟'' حضرت بشیرؓ نے کہا: کیوں نہیں! تو آپ ؐ نے فرمایا: ''پھر ایسا نہ کر۔''

بعض روایات میں ملتا ہے کہ حضرت بشیرؓ نے اپنے بیٹے نعمان بن بشیرؓ کو ایک باغ تحفے میں دیا تھا جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو تلقین کی کہ یا تو ایسا باغ اپنے تمام بچوں کو دو یا پھر اس سے بھی واپس لے لو۔

(۴۴) لوگوں سے بغیر کسی ضرورت کے مال طلب کرنا

سوال کرنا اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے' خصوصاً جب انسان کو کوئی ضرورت بھی درپیش نہ ہو۔ لوگوں سے بلاضرورت سوال کرنا حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ سَاَلَ وَعِنْدَهٗ مَا یُغْنِیْهِ فَاِنَّمَا یَسْتَکْثِرُ مِنَ النَّارِ— اَوْ قَالَ :مِنْ جَمْرِ جَهَنَّمَ)) فَقَالُوْا: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا یُغْنِیْهِ؟— اَوْ قَالُوْا: وَمَا الْغِنٰی الَّذِیْ لَا تَنْبَغِیْ مَعَهُ الْمَسْاَلَةُ؟ قَالَ : ((قَدْرُ مَا یُغَدِّیْهِ وَیُعَشِّیْهِ— اَوْ قَالَ : اَنْ یَکُوْنَ لَهٗ شِبْعُ یَوْمٍ وَّلَیْلَةٍ اَوْ لَیْلَةٍ وَیَوْمٍ))[٧]

''جس نے اس حال میں سوال کیا کہ وہ غنی ہے تو ایسا شخص (اپنے سوال سے) صرف آگ —— یا فرمایا: جہنم کے انگارے —— اکٹھے کر رہا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! ایسا غنی کہ جس کے لیے سوال کرنا جائز نہیں ہے' اس کی کیا تعریف ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس کے پاس کھانے کے لیے خوراک اور تن ڈھانپنے کے لیے کپڑوں کے بقدر —— یا فرمایا: ایک دن اور ایک رات کے لیے پیٹ بھر کر کھانے کو موجود ہو (تو وہ غنی ہے اور اس کے لیے سوال کرنا جائز نہیں ہے)''۔

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی جس دن کے کھانے کی ضرورت پوری ہو رہی ہو اُس دن اس کے لیے سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں جب یہ ختم ہو جائے یا اس کے پاس اتنا نہ ہو جو ایک دن کے لیے کفایت کرتا ہو تو پھر اس کے لیے سوال کرنا جائز ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا مزید ارشاد ہے:

((مَنْ سَأَلَ النَّاسَ اَمْوَالَهُمْ تَكَثُّرًا فَاِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْرًا فَلْيَسْتَقِلَّ اَوْ لِيَسْتَكْثِرْ))(۹)

''جس نے لوگوں سے ان کے مالوں کا سوال کیا تاکہ اپنا مال بڑھا سکے تو وہ (ان سے) انگارے مانگ رہا ہے' پس چاہے تو زیادہ مانگ لے یا چاہے تو کم مانگ لے''۔

(۴۵) قرض لے کر واپس نہ کرنا

حقوق اللہ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ توبہ واستغفار سے معاف کر دیتے ہیں' لیکن حقوق العباد کی معافی کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ جس بندے کا حق مارا ہے اُس کی تلافی کی جائے یا اس سے معافی طلب کی جائے۔ حقوق العباد سے متعلقہ کوتاہیوں میں سے ایک کوتاہی جو ہمارے ہاں عام طور پر پائی جاتی ہے' وہ یہ ہے کہ کچھ لوگ کسی سے قرض لیتے ہیں اور پھر اسے واپس نہیں کرتے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيْدُ اَدَاءَهَا اَدَّى اللّٰهُ عَنْهُ وَمَنْ اَخَذَ يُرِيْدُ اِتْلَافَهَا اَتْلَفَهُ اللّٰهُ))(۱۰)

''جس نے لوگوں کا مال (بطورِ قرض) حاصل کیا اور وہ اس کو واپس کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادائیگی کا سامان پیدا فرما دیں گے۔ اور جس نے لوگوں کا مال حاصل کر کے اسے ضائع کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے شخص کو ضائع کر دے گا''۔

شہید کا ہمارے دین میں بہت بڑا مقام ہے۔ مقبول شہادت سے انسان کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، لیکن قرض پھر بھی معاف نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْ اَنَّ رَجُلًا قُتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیِیَ ثُمَّ قُتِلَ ثُمَّ اُحْیِیَ ثُمَّ قُتِلَ وَعَلَیْہِ دَیْنٌ مَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ حَتّٰی یُقْضٰی عَنْہُ دَیْنُہٗ)) (۱۱)

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر کوئی آدمی اللہ کی راہ میں شہید ہو جائے پھر زندہ کیا جائے، پھر شہید ہو جائے پھر زندہ کیا جائے، پھر شہید ہو جائے اور اُس کے ذمہ قرض ہو تو وہ اُس وقت تک جنت میں داخل نہ ہوگا جب تک کہ اس کی طرف سے قرض ادا نہ کر دیا جائے''۔

اللہ کے رسول ﷺ ایسے شخص کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھاتے تھے جس کے بارے میں آپؐ کو معلوم ہو جاتا کہ یہ شخص مقروض تھا اور اس کا قرض ابھی تک ادا نہیں ہوا۔ حضرت سلمہ ابن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ اُتِیَ بِجَنَازَۃٍ لِیُصَلِّیَ عَلَیْھَا فَقَالَ: ((ھَلْ عَلَیْہِ مِنْ دَیْنٍ؟)) قَالُوْا لَا فَصَلّٰی عَلَیْہِ، ثُمَّ اُتِیَ بِجَنَازَۃٍ اُخْرٰی فَقَالَ: ((ھَلْ عَلَیْہِ مِنْ دَیْنٍ؟)) قَالُوْا نَعَمْ، قَالَ: ((صَلُّوْا عَلٰی صَاحِبِکُمْ)) قَالَ اَبُوْ قَتَادَۃَ: عَلَیَّ دَیْنُہٗ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ فَصَلّٰی عَلَیْہِ (۱۲)

''نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک جنازہ لایا گیا تاکہ آپؐ اس کی نماز جنازہ پڑھائیں۔ آپؐ نے سوال کیا: ''کیا اس (میت) کے ذمے کچھ قرض ہے؟'' صحابہؓ نے عرض کیا: نہیں، تو آپؐ نے اس شخص کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پھر ایک دوسرا جنازہ (آپؐ کے پاس) لایا گیا تو آپؐ نے دریافت کیا: ''کیا اس پر کوئی قرض ہے؟'' صحابہؓ نے کہا: جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو (میں نہیں پڑھاؤں گا)''۔ حضرت ابوقتادہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اس (میت) کا قرض میرے ذمے ہے، تو پھر آپؐ نے اس (میت) کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔''

اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے کتنی وعید ہے جو اس حال میں مر جاتے ہیں کہ ان کے ذمے لوگوں کا قرض باقی ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ انتہائی ضرورت کے وقت قرض لیں اور لیتے وقت یہ نیت ہو کہ اس کو ادا کریں گے، اور جلد از جلد ادا کرنے کی کوشش بھی کریں۔ جس شخص سے قرض لیا گیا ہو اگر اس کی وفات ہو جائے تو پھر اس کے ورثاء کو قرض کی رقم ادا کرنی چاہیے۔

(۴۶) حرام کھانا

اکثر افراد کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی کہ انہوں نے مال کہاں سے کمایا ہے' کن ذرائع سے حاصل کیا ہے' بلکہ ان کی اصل خواہش یہ ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ مال اکٹھا کیا جائے' چاہے وہ مال چوری کا ہو' یا رشوت کا ہو' یا کسی کا حق مار کر حاصل کیا گیا ہو' یا سود سے حاصل ہو' یا یتیم کا مال ہو' یا زکوٰۃ کی رقم ہو یا جھوٹ' فریب اور دھوکے سے حاصل کیا گیا ہو' وغیرہ۔ حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّـهٗ لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ))[۱]

''وہ جسم جنت میں ہرگز داخل نہ ہوگا جو کہ حرام کمائی سے پروان چڑھا ہو۔''

جس شخص کی کمائی حرام کی ہو اُس کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان ایک ایسے شخص کا نقشہ کھینچا جو کہ لمبا سفر کر کے بیت اللہ کی زیارت کے لیے آیا۔ اس کے سر کے بال گرد و غبار سے اَٹے ہوئے تھے اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا:

((..... يَارَبِّ يَارَبِّ وَمَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهٗ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ))[۱]

''.....اے میرے ربّ! اے میرے ربّ! حالانکہ اس کا کھانا حرام کا ہے' اس کا پینا حرام کا ہے' اس کا لباس حرام کا ہے اور حرام مال اس کی غذا ہے تو اس کی دعا کہاں سے قبول کی جائے!''

بیت اللہ جیسے بابرکت مقام میں اور حج جیسے عظیم موقع پر ایک شخص خانہ کعبہ کے پردے پکڑ پکڑ کر ہی کیوں نہ دعا کرے اس کی دعا اُس وقت تک قبول نہ ہوگی جب تک کہ اس کا رزق حلال نہ ہوگا۔ آج کل ہماری دعاؤں کے قبول نہ ہونے کی وجوہات میں ایک بڑی وجہ رزقِ حلال کا نہ ہونا بھی ہے۔

(۴۷) شراب پینا

شراب میں آخرت کی سزا کے ساتھ ساتھ دنیا کا نقصان اور رسوائی بھی شامل ہے۔ شراب نوشی کی کثرت انسانی عقل کو زائل کر دیتی ہے اور انسان قتل و غارت اور زنا جیسے قبیح جرائم تک کا ارتکاب کرنے لگ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام قرار دیا ہے۔ ارشادِ

باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۹۰﴾ (المائدۃ)

''یقیناً شراب اور جوا اور آستانے اور فال کے تیر گندگی ہیں اور شیطانی اعمال ہیں' پس ان سے بچو تا کہ تم فلاح پا سکو۔''

آئے روز شراب کی نئی نئی قسمیں بازاروں میں آتی رہتی ہیں اور لوگ شراب کا بس نام بدل کر شراب نوشی کر رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((يَشْرَبُ نَاسٌ مِّنْ اُمَّتِي الْخَمْرَ يُسَمُّوْنَهَا بِغَيْرِ اسْمِهَا))(۱۵)

''میری اُمت میں سے کچھ لوگ شراب کو پئیں گے (اس طرح کہ) وہ اس کا نام تبدیل کر دیں گے''۔

بعض گمراہ کن افکار رکھنے والے دانشور یہ نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں کہ شراب اُس وقت حرام ہوتی ہے جبکہ اس کے پینے سے نشہ پیدا ہو' اور اگر اس سے نشہ پیدا نہ ہو تو یہ حلال ہے۔ یہ نقطۂ نظر صریح احادیث کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَا اَسْكَرَ كَثِيْرُهُ فَقَلِيْلُهُ حَرَامٌ))(۱۶)

''جس کی کثیر مقدار نشہ دے اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔''

یعنی اگر شراب کی تھوڑی سی مقدار سے نشہ نہ بھی پیدا ہو یہ پھر بھی حرام ہے' کیونکہ اس کی کثیر مقدار سے نشہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے شراب کی طرح اس سے ملتی جلتی اشیاء جن میں نشہ پایا جاتا ہے' مثلاً ہیروئن' چرس' بھنگ اور افیون وغیرہ کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ))(۱۷)

''ہر نشہ دینے والی چیز شراب ہے اور ہر نشہ دینے والی چیز حرام ہے''۔

شراب نوشی کی آخرت کی سزا کے علاوہ دنیا میں بھی اس کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک شراب نوشی کی حد اسّی (۸۰) کوڑے ہے' جبکہ بعض فقہاء کے نزدیک اس کی حد چالیس (۴۰) کوڑے ہے۔ بہر حال کوڑوں کی تعداد چاہے کچھ بھی ہو' اصل مقصود شراب پینے والے کی دنیا میں ذلت و رسوائی ہے' تا کہ دوسرے لوگ اس سے عبرت پکڑ کر اس قبیح فعل سے اجتناب کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ وَسَكِرَ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةٌ اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا' فَاِنْ مَاتَ دَخَلَ النَّارَ' فَاِنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ)) (۱۸)

''جس نے شراب پی اور نشے میں آ گیا تو چالیس روز تک اس کی کوئی نماز قبول نہ ہوگی' اور اگر وہ مر گیا تو جہنم میں داخل ہوگا' البتہ اگر اس نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرمائے گا۔''

(۴۸) سونے اور چاندی کے برتنوں کا استعمال

سونے اور چاندی کے برتنوں کو استعمال کرنے اور ان میں کھانے پینے سے اللہ کے رسول ﷺ نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ شَرِبَ فِیْ اِنَاءٍ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ فِضَّةٍ فَاِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِیْ بَطْنِهٖ نَارًا مِنْ جَهَنَّمَ)) (۱۹)

''جس نے سونے یا چاندی کے برتن میں پیا تو دراصل وہ شخص اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہا ہے۔''

(۴۹) جھوٹی گواہی دینا

اللہ تعالیٰ نے جھوٹی گواہی دینے سے منع کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ﴿۳۰﴾﴾ (الحج)

''پس بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی شہادت سے بچو۔''

اللہ کے رسول ﷺ نے جھوٹی شہادت کو کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِاَكْبَرِ الْكَبَائِرِ؟)) (ثَلَاثًا) قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ' قَالَ: ((اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ)) وَجَلَسَ وَكَانَ مُتَّكِئًا' فَقَالَ: ((اَلَا وَقَوْلُ الزُّوْرِ)) قَالَ فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا حَتّٰى قُلْنَا لَيْتَهٗ سَكَتَ (۲۰)

''کیا میں تم کو سب سے بڑے گناہوں کے بارے میں خبر نہ دوں؟'' آپؐ نے تین مرتبہ یہ بات دہرائی۔ صحابہؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول ﷺ! آپؐ نے

فرمایا: ''وہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا ہے''۔ آپؐ تکیہ لگائے بیٹھے تھے کہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: ''آگاہ رہو! اور جھوٹی گواہی بھی (ان میں شامل ہے)''۔ راوی کہتے ہیں کہ آپؐ بار بار یہ الفاظ دہراتے رہے یہاں تک کہ ہم یہ خواہش کرنے لگے کہ آپؐ خاموش ہو جائیں۔''

جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام ہے اسی طرح سچی گواہی کو چھپانا بھی گناہِ کبیرہ ہے۔ قرآن نے گواہی کو چھپانے سے منع کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ (البقرۃ:۲۸۳)

''اور گواہی کو مت چھپاؤ۔ اور جو گواہی کو چھپائے گا اس کا دل گناہ گار ہوگا۔''

اگر ہمیں کہیں گواہی دینی پڑ جائے تو صرف اس بات کی گواہی دیں جو کہ ہمارے علم میں ہو، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا تھا:

﴿وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا﴾ (یوسف:۸۱)

''ہم تو صرف اس بات کی گواہی دیتے ہیں جو ہمارے علم میں ہے۔''

حواشی

۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب قول اللّٰہ تعالیٰ: ﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ﴾.

۲) صحیح مسلم، کتاب السلام، باب استحباب الرقیة من العین والنملة والحمة والنظرة۔

۳) سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی الهدیة لقضاء الحاجة۔

٤) سنن ابن ماجه، کتاب الأحکام، باب أجر الأجراء۔

٥) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب اثم من باع حرّا۔

٦) صحیح مسلم، کتاب الهبات، باب کراهة تفضیل بعض الاولاد فی الهبة۔

۷) صحیح مسلم، کتاب الهبات، باب کراهة تفضیل بعض الاولاد فی الهبة۔

۸) سنن ابی داؤد، کتاب الزکاة، باب من یعطی من الصدقة وحد الغنی۔

۹) صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب کراهة المسألة للناس۔

۱۰) صحیح البخاری، کتاب فی الاستقراض وأداء الدیون والحجر والتفلیس، باب من أخذ اموال الناس یرید اداء ها او اتلافها۔

۱۱) سنن النسائی، کتاب البیوع، باب التغلیظ فی الدین۔

۱۲) صحیح البخاری، کتاب الحوالات، باب من تکفل عن میت دینا فلیس له ان یرجع۔

۱۳) سنن الدارمی، کتاب الرقاق، باب فی أکل السحت۔

١٤) صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب و تربيتها۔
١٥) سنن النسائی، كتاب الأشربة، باب منزلة الخمر۔
١٦) سنن الترمذی، كتاب الأشربة عن رسول اللهﷺ، باب ما جاء ما أسكر كثيره فقليله حرام۔
١٧) صحيح مسلم، كتاب الأشربة، باب بيان ان كل مسكر خمر وان كل خمر حرام۔
١٨) سنن ابن ماجه، كتاب الأشربة، باب من شرب الخمر لم تقبل له صلاة۔
١٩) صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم استعمال اوانی الذهب والفضة فی الشرب۔
٢٠) صحيح البخاری، كتاب الشهادات، باب ما قيل فی شهادة الزور۔

اسلام میں تجدّد پسندی کے اثرات

حافظ طاہر اسلام عسکری

عباسی دورِ خلافت (۲۰۰ ہجری) میں جب یونانی فلسفہ عربی زبان میں منتقل ہوا تو اس کے ردّعمل میں مسلمان دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک عظیم اکثریت نے تو اس کو قرآن وسنت کی روشنی میں یکسر مسترد کر کے اس کے تار و پود بکھیر دیے جبکہ دوسرے گروہ نے (جو بالکل قلیل افراد پر مشتمل تھا) اس سے مرعوب ہو کر اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ پہلا گروہ اہل سنت کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرے نے معتزلہ کے نام سے شہرت پائی۔ معتزلہ نے فلسفۂ یونان سے مرعوب ہو کر اپنے تئیں وحی اور فلسفے میں تطبیق دینے کی کوشش کی۔ چنانچہ انہوں نے عقل کو اصل قرار دیا اور شریعت کو اس کے تابع کرنے کے لیے عقل و منطق اور لغت سے استدلال پر زور دیا۔ یونانی فلاسفہ کے نظریات چونکہ اسلامی عقائد و افکار سے بہت کچھ مختلف تھے اور شریعت میں ان نظریات کو فروغ دینے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ رسول کریم ﷺ کی حدیث وسنت تھی، جو قرآن کی حتمی تعبیر کی شکل میں مسلمانوں میں عملاً رائج تھی، لہٰذا انہوں نے انکارِ سنت کی راہ اپنائی۔ نتیجۃً یونانی فلسفے کی روشنی میں جدید اصولوں کی بنیاد پر معتزلہ کا نیا اسلام وجود میں آیا جس کا کوئی تصور صحابہ رضی اللہ عنہم وسلف صالحینؒ میں موجود نہ تھا۔

حکومتی سرپرستی کی بنا پر اس فکر کو کچھ عرصہ پھلنے پھولنے کا موقع ملا، لیکن ائمۂ اہل سنت کی سخت مخالفت کی بنا پر یہ فکر عامۃ الناس میں مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ علمائے سلف کی پیہم کوششوں سے اعتزالی فکر کا دورِ اوّلین اپنے انجام کو پہنچا اور اس کا وجود واقعاتی طور پر ختم ہو کر ایک تاریخی واقعے کی حیثیت سے کتابوں کے صفحات میں محدود ہو کر رہ گیا۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب سائنس نے پاپائیت سے ایک طویل تصادم کے بعد تفوّق و برتری حاصل کی تو اسے مذہب کے خلاف سائنس کی فتح قرار دیا گیا اور اس کے اثرات عالمگیر سطح پر مرتب ہوئے۔ سائنس کو انکارِ مذہب کے مترادف سمجھا جانے لگا اور الحاد و لادینیت کا دَور دَورہ ہوا۔ پہلے کی طرح اِس بار بھی اس کے ردّعمل میں مسلمانوں کی طرف سے دو طرح کا طرزِ عمل سامنے آیا۔ ایک طرف راسخ اور پختہ فکر علماء تھے جنہوں نے واضح کیا کہ مذہب کی بنیاد وحی ہے اور دنیا کی کوئی بھی مسلّمہ حقیقت مذہب کے خلاف نہیں ہو سکتی اور مغرب میں اصل معرکہ مذہب و سائنس کی بجائے عیسائی پادریوں کے ذاتی نظریات (جنہیں مذہب کا نام دیا گیا تھا) اور سائنسی دریافتوں کے مابین تھا، لہٰذا سائنس کے لیے انکارِ وحی کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان حضرات میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہم اللہ کے اسمائے گرامی نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

اس کے بالمقابل دوسرے گروہ نے ایک اور راہ اپنائی اور وہ یہ کہ انہوں نے مغربی نظریات کو مسلّمہ حقائق کا درجہ دے کر وحی کو اُن کے مطابق ڈھالنے کے لیے تاویلات شروع کر دیں۔ یہ فکرِ اعتزال کا دَورِ ثانی تھا جس کے سرخیل سرزمین ہند میں سرسید احمد خان تھے۔ اس طرزِ عمل کی اصل بنیاد بھی وہی مرعوبانہ و شکست خوردہ ذہنیت تھی۔ مغربی افکار کی رو سے وہی چیز قابل تسلیم تھی جسے عقل و تجربہ کی کسوٹی پر پرکھا جا سکے۔ ہر بات جو خلافِ فطرت ہو اُسے خلافِ عقل کہہ کر ردّ کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ سرسید نے فطرت (نیچر) کی برتری کا نعرہ لگایا۔ لغت کی مدد سے قرآن کی تاویل کی گئی، احادیث کو مشکوک قرار دیا گیا اور اُمت کے اجتماعی طرزِ عمل کو ائمۂ مجتہدین کے ذاتی خیالات و اجتہادات کہہ کر نظرانداز کر دیا گیا اور یوں اپنی من مانی تاویلات کے لیے راہ ہموار کی گئی۔ نیچر اور لغت کی بنیاد پر بنائے گئے اصولوں کے تحت اسلام کی جو تشریح مسلمانوں کے سامنے آئی وہ ان کے صدیوں کے اجتماعی تعامل سے یکسر مختلف تھی۔

سرسید کے اس اعتزالی فکر کی دوسری کڑی جناب غلام احمد پرویز ہیں جو اپنے امام سرسید احمد خان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے لغت پرستی اور انکارِ سنت کے حوالے سے کافی معروف ہوئے۔ غلام احمد پرویز کے بعد اَب ان کی اس فکر کو جناب جاوید احمد غامدی صاحب نے کچھ علمی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ البتہ سرسید اور غلام احمد پرویز کے انجام سے بچنے کے لیے جناب غامدی صاحب نے اس فکر کو ایک نئے رنگ و

روپ میں پیش کیا۔انہوں نے لغت قرآن کی بجائے عربی معلیٰ یعنی عربی محاورے کا نعرہ لگایا اور انکارِ سنت کا کھلم کھلا دعویٰ کرنے کی بجائے حدیث وسنت میں فرق کے عنوان سے انکارسنت کے مقصد کو پورا کیا۔اس کے باوجود غامدی صاحب نے اس احتیاط کے پیش نظر کہ کہیں علماء ان کو سرسید اور پرویز کے ساتھ منسوب نہ کر دیں' انہوں نے اپنے آپ کو مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا حمید الدین فراہی کے فکر کے حاملین میں سے گنوانا شروع کر دیا۔لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ غامدی صاحب جس اسلام کو پیش کر رہے ہیں وہ مولانا اصلاحی یا مولانا فراہی کا اسلام نہیں ہے' بلکہ وہ سرسید احمد خان اور غلام احمد پرویز کا اسلام ہے۔ موجودہ مادی دَور میں ہر مادیت پسند فرد مغربی تہذیب کی چکا چوند سے انتہائی مرعوب ومتأثر ہے۔مغرب اپنے سیاسی غلبے کے ساتھ ساتھ پوری دنیا میں بالعموم اور عالم اسلام میں بالخصوص اپنی تہذیب کو غالب کرنے کے لیے پوری قوت ومستعدی سے کوشاں ہے۔اس سلسلے میں اسے کافی کامیابی حاصل ہورہی ہے جس کا ایک سبب تو نام نہاد مسلم حکومتوں کا مغرب کی غیر مشروط اطاعت ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ مسلمان ''اسکالرز'' بھی علم وتحقیق کے نام پر مغربی تہذیب کو قرآن وسنت سے کشید کر کے اسے تقویت پہنچا رہے ہیں۔افسوس ہے کہ جناب غامدی صاحب کا شمار بھی انہی اسکالرز میں ہوتا ہے۔آپ کی نادر تشریحات اور علمی تحقیقات سے (دانستہ یا نادانستہ طور پر) مغربی تہذیب کی ترویج وتائید ہورہی ہے۔

جناب غامدی صاحب نے بھی اپنے پیش روؤں کی طرح اسلام کی تعبیر وتفہیم میں منہجِ سلف کی بجائے اپنے فہم پر مبنی اصولوں کو بنیاد بنایا ہے۔موصوف وحی کی تعبیر وتشریح میں عقل وفطرت اور محاورۂ عرب (ادبِ جاہلی) کو اصل قرار دیتے ہیں۔غامدی صاحب کی نادر تشریحات وتحقیقات کے نتیجے میں اسلام کا جو نیا روپ سامنے آرہا ہے اُمت کے مسلّمات کے برعکس عام اہل اسلام کے لیے بالکل اجنبی ہے۔

جس اسلام کو غامدی صاحب اور ان کے متبعین پیش کر رہے ہیں ذرا اس کی ایک جھلک قارئین ملاحظہ فرمالیں کہ جس کے بعد ایک عام شخص کے لیے بھی یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ غامدی صاحب کا شمار بقول ان کے اصلاحی صاحب کے شاگردوں میں ہوتا ہے یا وہ غلام احمد پرویز کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

مسلّمات سے انحراف

(۱) مرتد کی سزا کا مسئلہ [۱]

اسلام لانے کے بعد اگر کوئی شخص مذہب تبدیل کر کے اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے تو اسے ارتداد اور اس کے مرتکب شخص کو مرتد کہا جاتا ہے اور اس کی سزا نصوصِ شرعیہ میں قتل بیان ہوئی ہے۔مرتد کے حوالے سے غامدی مکتب فکر کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ سزا صرف نبی کریم ﷺ کی قوم بنی اسماعیل کے مرتدین کے لیے خاص تھی' اس کے بعد کسی شخص کو ارتداد کی یہ سزا نہیں دی جاسکتی۔

اس کے برعکس فقہ اسلامی کی مایہ ناز وشہرۂ آفاق کتاب 'بدایۃ المجتہد' (حال ہی میں اس کتاب کا اردو ترجمہ جناب غامدی صاحب کے ایما پر شائع کیا گیا ہے) میں ہے:

والمرتد اذا ظفر به قبل ان يحارب فاتفقوا على انه يقتل الرجل لقوله عليه الصلوٰة والسلام: ((مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ)) (۲/۴۲۷)

''مرتد اگر لڑائی کرنے سے قبل قابو میں آجائے تو علماء کا اتفاق ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے گا' کیونکہ حدیث نبویؐ ہے ''جو شخص اپنا دین بدل دے اسے قتل کر دو''۔

اُمت مسلمہ میں سے کسی عالم نے آج تک اس نکتے کو اُجاگر نہیں کیا کہ اس حدیث کا تعلق تو محض بنی اسماعیل کے ساتھ خاص ہے' بلکہ تمام اہل علم کے نزدیک بالاتفاق یہ حکم عام ہے۔لیکن ہمارے مہربان حضرات اس اتفاقی ومسلّمہ رائے کو ماننے سے بھی انکاری ہیں۔

(۲) حدِّ رجم کا انکار

شادی شدہ شخص اگر زنا کا ارتکاب کرے تو صحیح احادیث[۲] کی رو سے اس کی سزا رجم ہے (یعنی پتھر مار مار کر مار دیا جائے)۔ اُمت کے تمام اہل علم کا سلف سے خلف تک اس پر اتفاق ہے۔ چنانچہ موسوعۃ الاجماع میں ہے:

إن المسلمين اجمعوا على ان الزانی المحصن' اذا زنی عامدا' عالما' مختارا' فحدّه الرجم حتی یموت' وقالت الخوارج وبعض المعتزلة بعدم الرجم[۳]

''مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ زانی محصن جب عمداً' جانتے ہوئے اور اپنے اختیار سے زنا کا مرتکب ہو تو اس کی سزا رجم ہے یہاں تک کہ وہ مر جائے' جبکہ خارجیوں اور بعض معتزلہ کا موقف رجم نہ کرنے کا ہے۔''

قاضی ابن رشد بدایۃ المجتہد میں لکھتے ہیں:

فأما الثيب الاحرار المحصنون فان المسلمين اجمعوا على حدهم الرجم الامزقة من اهل الأهواء فانهم رأوا ان حد كل زان الجلد[۴]

''شادی شدہ آزاد محصن (زانی) کے بارے میں مسلمانوں کا اجماع ہے کہ ان کی حد رجم ہے' سوائے خواہش پرستوں کے ایک گروہ کے 'کہ وہ ہر زانی کی سزا کوڑے تجویز کرتے ہیں۔''

اہل اسلام کا اجماعی و اتفاقی موقف جاننے کے بعد اب یہ ملاحظہ کیجیے کہ خوارج' معتزلہ اور خواہش پرستوں کے نقطۂ نظر کو جناب جاوید احمد صاحب غامدی نے اپنے استاد امام مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی اتباع میں اختیار کر رکھا ہے اور اپنی کتاب 'برھان' میں اہل اسلام کے متفقہ موقف پر تنقید کرنے کا شوق پورا فرما رہے ہیں۔

(۳'۴) شخص دجال کا انکار' یاجوج و ماجوج مغربی اقوام ہیں

نبی کریم ﷺ نے قربِ قیامت کے حوالے سے کئی پیشین گوئیاں فرمائی ہیں جنہیں ائمۂ محدثین نے 'اشراط الساعۃ' کے عنوان سے کتاب احادیث میں روایت کیا ہے۔ انہی میں سے ایک اہم پیشین گوئی دجال سے متعلق بھی ہے۔ آپؐ نے اسے ایک عظیم آزمائش (فتنہ) قرار دیا ہے۔ اس فتنہ کی سنگینی و شدت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ آپؐ باقاعدہ اس سے اللہ کی پناہ طلب کیا کرتے تھے اور اس کی تعلیم اُمت کو بھی دی۔

اس عظیم فتنے کے حوالے سے اہل اسلام کا اتفاقی نقطۂ نظر اور عقیدہ یہ ہے کہ وہ دجال ایک شخص معین ہے' جیسا کہ احادیث میں اس کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ موسوعۃ الاجماع میں ہے:

مذهب اهل الحق صحة وجود الدجال وانه شخص بعينه ابتلى الله به عباده[۵]

''اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ دجال کا وجود برحق ہے اور وہ ایک شخصِ معین ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو آزمائے گا۔''

اس کے بعد احادیث سے ثابت شدہ اس کی صفات و افعال کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

وهذا كله مذهب اهل السنة' وجميع المحدثين والفقهاء والنظار خلافا لمن انكره وابطل امره من الخوار والجهمية وبعض المعتزلة

''اور (جو کچھ بیان ہوا) یہ سارے کا سارا اہل سنت' تمام محدثین' فقہاء اور متکلمین کا مذہب ہے' ان لوگوں کے برعکس جنہوں نے اس کا انکار کیا اور اس (دجال) کے معاملے کو خوارج' جہمیہ اور بعض معتزلہ نے باطل قرار دیا ہے۔''[۶]

یہ تو تھا اہل حق کا دجال کے بارے میں عقیدہ' لیکن غامدی مکتب فکر اس مسئلہ میں بھی پوری اُمت سے ہٹ کر خوارج' جہمیہ اور معتزلہ کی ہمنوائی میں دجال کے شخصِ معین ہونے کا انکاری ہے۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد' ظہورِ مہدی اور دجال کے بارے میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں' اشراق کے جنوری ۱۹۹۶ء کے شمارے میں لکھا گیا ہے:

''دجال کا خروج ہمارے نزدیک یاجوج و ماجوج کے خروج کا بیان ہے۔ دجال ایک اسمِ صفت ہے جس کے معنی بہت بڑے فریب کار کے ہیں۔''[۷]

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ یاجوج و ماجوج کون ہیں اور پھر آخر میں لکھا ہے:

''ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نبی ﷺ نے قیامت کے قریب 'یاجوج و ماجوج' ہی کے خروج کو دجال سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یاجوج و ماجوج کی اولاد یہ مغربی اقوام' عظیم فریب پر مبنی فکر و فلسفہ کی علم بردار ہیں اور اسی سبب سے نبی ﷺ نے انہیں دجال (عظیم فریب کار) قرار دیا ہے۔ روایات میں دجال کی ایک صفت یہ بھی بیان ہوئی ہے کہ اس کی ایک آنکھ خراب ہوگی۔ یہ بھی درحقیقت مغربی اقوام کی انسان کے روحانی پہلو سے پہلوتہی اور صرف مادی پہلو کی جانب جھکاؤ کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح مغرب کی طرف سے سورج کا طلوع ہونا بھی غالباً مغربی اقوام کے سیاسی عروج ہی کے لیے کنایہ ہے۔''(۸)

اس اقتباس کا حاصل یہ ہے کہ دجال کوئی خاص شخص نہیں' بلکہ اس سے مراد یاجوج و ماجوج ہیں اور یاجوج و ماجوج سے مراد مغربی اقوام ہیں۔ گویا یہاں بھی فرقۂ غامدیہ پوری اُمت سے بالکل مختلف نقطہ نظر رکھتا ہے جس کا سلف و خلف میں سے کوئی بھی قائل نہیں۔ اس اقتباس میں سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کو بھی کنایہ قرار دیا گیا ہے جبکہ امت کا اس کے حقیقتاً مغرب سے طلوع ہونے پر بھی اتفاق ہے۔

(۶'۵) اہل کتاب اور ہندوؤں کو کافر و مشرک کہنے سے انکار

وہ اُمور جن میں غامدی مکتب فکر نے اُمت سے بالکل الگ موقف اپنایا ہے' ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی بھی یہودی' عیسائی' ہندو یا دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے فرد کو کافر یا مشرک نہیں کہا جا سکتا۔ کسی سائل نے پوچھا:

''اہل کتاب کو کافر کہنا درست ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدۃ کی آیت ۷۲ میں عیسائیوں کے عقیدہ کو کفر سے تعبیر کیا ہے۔''

اس کے جواب میں اشراق کے دسمبر ۲۰۰۰ء کے شمارہ میں لکھا گیا:

''کسی کو کافر قرار دینا ایک قانونی معاملہ ہے۔ پیغمبر اپنے الہامی علم کی بنیاد پر کسی گروہ کی تکفیر کرتا ہے۔ یہ حیثیت اب کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اب ہمارا کام یہی ہے کہ ہم مختلف گروہوں کے عمل و عقیدہ کی غلطی واضح کریں اور جو لوگ نبی ﷺ کی نبوت کو نہیں مانتے' انہیں بس غیر مسلم سمجھیں اور ان کے کفر کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔''(۹)

اسی طرح ''کیا ہندو مشرک ہیں؟'' کے عنوان کے تحت کہا گیا:

''ہمارے نزدیک مشرک وہ شخص ہے جس نے شرک کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی شرک ہی کو بطور دین اپنا رکھا ہو۔ چونکہ اب کسی ہندو کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے شرک کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی شرک ہی کو بطور دین اپنا رکھا ہے' لہٰذا اسے مشرک نہیں قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ قرآن کے اس حکم کا اطلاق اس پر کیا جا سکتا ہے۔''(۱۰)

ان اقتباسات کا حاصل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعد کسی کو کافر کہنا درست نہیں۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ اس مسئلے میں علمائے اسلام کی متفقہ رائے کیا ہے۔ 'موسوعۃ الاجماع' میں ''من هو الكافر'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

اتفقوا على ان من لم يؤمن بالله تعالى وبرسوله ﷺ ..... فان من جحد شيئا مما ذكرنا' او شك في شيء منه' ومات على ذلك' فانه كافر' مشرك' مخلد في النار ابدا(۱۱)

''علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہ لائے گا..... پس جس نے بھی ان میں سے کسی چیز کا انکار کیا یا اس میں شک کیا اور اسی حالت میں مر گیا تو وہ کافر' مشرک اور مخلد فی النار ہوگا''۔

اسی صفحہ پر 'تسمية اهل الكتاب كفارا' کے عنوان کے تحت یہ عبارت بھی موجود ہے:

''**اتفقوا على تسمية اليهود والنصارىٰ كفارا**'' (۱۲)

''تمام اہل اسلام کا یہود و نصاریٰ کو کفار سے موسوم کرنے پر اتفاق ہے۔''

اب یہاں اس قسم کی کوئی قید مذکور نہیں کہ کسی کو کافر تو صرف نبی اپنے الہامی علم کی بنیاد پر ہی کہہ سکتا ہے یا کسی کو مشرک قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شرک کی حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد اس پر کاربند ہو۔ لہٰذا یہ قیود محض اہل اشراق کی اپنی وضع کردہ ہیں' اہل علم کے

ہاں ان کا کوئی وجود نہیں۔

یہ منطق انتہائی عجیب ہے کہ مشرک اپنے شرک کی حقیقت سے واقف ہو ورنہ وہ مشرک نہیں۔ اس طرح تو کوئی مجرم جرم کے بعد یہ کہہ کر چھوٹ سکتا ہے کہ میں اسے جرم نہیں سمجھتا۔ تو کیا ہم اسے مجرم نہیں کہیں گے؟

امر واقعہ یہ ہے کہ باطنی حالات و کیفیات کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ ہم تو معاملات کے ظاہر کے مکلّف ہیں۔ ظاہری طور پر ایک کام اگر غلط ہے تو اس کے مرتکب کو غلط کار ہی کہا جائے گا' البتہ اس سے معاملہ کرتے ہوئے یہ دیکھا جائے گا کہ وہ کس حد تک اس معاملے سے باخبر تھا' لیکن اس سے معاملے کی حقیقت تو نہیں بدلے گی۔ ایک شخص اگر کسی کو قتل کرتا ہے تو وہ قاتل ہے۔ اب یہ تو دیکھا جا سکتا ہے کہ قتل عمد ہے یا قتل خطا؟ لیکن قتل بہر حال قتل ہی رہے گا اور اس کا مرتکب قاتل کہلائے گا۔ چاہے محرکِ قتل مختلف ہونے کی بنا پر دنیا میں اس کے ساتھ معاملہ مختلف کیا جائے۔ اسی طرح جب یہ بات طے ہے کہ فلاں عقیدہ و نظریہ یا فعل شرک ہے تو اس کا مرتکب لامحالہ مشرک ہی کہلائے گا اور اس سے اسی طرح کا معاملہ کیا جائے گا۔ رہا اس کی آخرت کا معاملہ تو اس کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ ہم کسی معین شخص کے جنتی یا جہنمی ہونے کا حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

دراصل ظاہری و باطنی اور دُنیوی و اُخروی اُمور میں امتیاز کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے معاملہ خلط مبحث کا شکار ہو گیا ہے' ورنہ بات بالکل واضح ہے۔ مزید برآں اس حقیقت پر بھی غور کیا جانا چاہیے کہ صدرِ اوّل سے آج تک سلف و خلف کے تمام اہل علم عقائد کے باب میں 'اصول تکفیر' کے مستقل عنوان کے تحت اس پر بحث کرتے رہے ہیں کہ کب کسی شخص کو کافر قرار دیا جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کے بعد کسی کو کافر یا مشرک کہنا ممکن ہی نہیں تو 'اصول تکفیر' بیان کرنے کا فائدہ یا مقصد کیا ہے؟ گویا یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ جملہ علمائے اسلام ایک فضول و عبث کام میں مشغول رہے!

یہاں ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ علماء نے تکفیر کے مسلّمہ اُصولوں کی روشنی میں کئی باطل گروہوں کو کافر قرار بھی دیا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں تمام مکاتب فکر کے علماء نے متفقہ طور پر قادیانیوں کو کافر قرار دیا اور اسے آئینی طور پر بھی تسلیم کیا گیا۔ یاد رہے کہ اس فتوے کو پوری دنیا کے علماء کی تائید حاصل ہے۔

تفصیل بالا سے معلوم ہوا کہ آج بھی یہود و نصاریٰ کو کافر اور ہندوؤں کو مشرک کہا جا سکتا ہے اور یہی تمام اہل اسلام کا اجماعی نقطۂ نظر ہے۔ (جاری ہے)

(۷) مسلم خاتون کا غیر مسلم سے شادی کرنا

اسلام کے قانون نکاح کی رو سے ایک مسلم مرد کے لیے اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے' جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ.....﴾(المائدہ:۵)

''اور پاک دامن عورتیں اُن میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی (تمہارے لیے حلال ہیں)۔''

ظاہر ہے کہ یہ اجازت صرف مسلم مردوں کے ساتھ خاص ہے۔ علاوہ ازیں مسلمان مردوں اور عورتوں کو مشرکین سے نکاح کرنے سے روک دیا گیا ہے۔

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ﴾ (البقرہ:۲۲۱)

''تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا' جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مؤمن لونڈی آزاد مشرک عورت سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح آزاد مشرک مردوں سے نہ کرو' جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مؤمن غلام آزاد مشرک مرد سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔''

مندرجہ بالا دو آیات سے معلوم ہوا کہ:

(۱) مسلمان مرد مسلمان عورت کے علاوہ اہل کتاب کی عورت سے بھی شادی کرسکتا ہے۔ (۲) اس کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی خاتون سے شادی کرنا اس کے لیے جائز نہیں۔ (۳) مسلمان خواتین اہل کتاب کے مردوں سے شادی نہیں کرسکتیں۔ ورنہ صرف اہل کتاب خواتین کے حلال ہونے کا ذکر بے معنی ہوگا۔ (۴) مسلمان مرد وزن کے لیے مشرکین سے نکاح کرنا ممنوع ہے۔

اب اس کے برعکس غامدی مکتب فکر کا نقطہ نظر ملاحظہ فرمائیے:

کسی خاتون نے سوال پوچھا کہ میں ایک مسلمان لڑکی ہوں اور ایک ہندو لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہوں' کیا مجھے اس کی اجازت ہے؟ اس کے جواب میں قرآن مجید کی متذکرہ بالا دو آیات ذکر کرنے کے بعد کہا گیا:

''ایک مسلمان لڑکی کے ایک غیر مسلم لڑکے سے شادی کرنے کا براہ راست ذکر سوائے مشرک مردوں کے قرآن مجید میں مثبت یا منفی' کسی پہلو سے موجود نہیں ہے۔ یعنی اسلامی شریعت میں یہ واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا کہ ان کی شادی ہوسکتی ہے یا نہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں مسلمان علماء کی آراء مختلف ہوسکتی ہیں۔ ہماری رائے میں غیر مسلم کے ساتھ شادی کو ممنوع یا حرام قرار نہیں دیا جاسکتا' البتہ قرآن مجید کی واضح ممانعت نہ ہونے کی بنا پر ایسی شادی غیر پسندیدہ قرار دی جاسکتی ہے۔ اس معاملے میں بہرحال آخری فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے کہ شادی کی جائے یا نہ۔''(۱۴)

ملاحظہ فرمائیے کہ کس کمال فن سے علمی مغالطہ دیا گیا ہے کہ قرآن میں واضح طور پر مسلمان خاتون کی غیر مسلم سے شادی کی ممانعت کا ثبوت نہیں ملتا۔ اولاً تو سوال یہ ہے کہ ''واضح'' سے کیا مراد ہے؟ اگر وضاحت الفاظ کے علاوہ بھی ہوسکتی ہے تو وہ قرآن میں موجود ہے اور وہ اس طرح کہ جب اہل کتاب کی خواتین سے صرف مسلمان مرد کو شادی کی اجازت دی گئی ہے تو مسلمان خواتین کے لیے اس اجازت کا نہ ہونا آپ سے آپ معلوم ہوگیا۔ بصورتِ دیگر اس خصوصیت کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا۔ ثانیاً حرمت کا واضح ذکر نہ ہونے سے جواز کیسے ثابت ہوگیا' اس کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی گئی اور اہل علم کے ہاں مسلّمہ قاعدہ ہے کہ 'الاصل فی التحریم' یعنی منکحات میں اصل حرمت ہے۔ یعنی کسی سے تعلق زوجیت قائم کرنے کے لیے شریعت کی صریح اجازت کی ضرورت ہے' بصورت دیگر یہ جائز نہ ہوگا۔

ثالثاً یہ کہنا کہ اس مسئلے میں مسلمان علماء کی آرا مختلف ہوسکتی ہیں' محض ایک فلسفیانہ احتمال ہے جو کسی بھی معاملے میں اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس امر واقعہ میں اس مسئلے میں چودہ صدیوں سے آج تک مسلمان علماء کے ہاں کوئی اختلاف سامنے نہیں آیا کہ مسلمان عورت کی غیر مسلم سے شادی نہیں ہوسکتی۔ موسوعۃ الاجماع میں 'نکاح غیر المسلم للمسلمۃ' کے عنوان کے تحت لکھا ہے: ''الاجماع علی تحریم نکاح الکافر للمرأۃ المسلمۃ'(۱۵) ''کافر کی مسلمان خاتون سے شادی کے حرام ہونے پر اجماع ہے''۔

معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں بھی غامدی مکتب فکر (شاید شوق انفرادیت میں) پوری امت سے الگ راہ پر کھڑا ہے۔ نیز موسوعۃ الاجماع کے مذکور حوالے سے یہ بھی پتہ چلا کہ اہل علم کے ہاں غیر مسلم اور کافر کے الفاظ مترادف کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

(۸) داڑھی رکھنا دین کی رو سے ضروری نہیں

اہل 'المورد' کے امت مسلمہ کے مسلمات سے انحراف کی فہرست میں یہ مسئلہ بھی شامل ہے کہ ان کے نزدیک داڑھی رکھنا دین کی رو سے ضروری نہیں۔ ان سے جب یہ سوال کیا گیا کہ:

''میں نے کچھ عرصہ پہلے داڑھی رکھی مگر میری امی اور سب گھر والوں کو پسند نہ آئی کیونکہ بال ٹھیک طرح سے نہ آئے تھے۔ اب امی بار بار مجھے داڑھی کٹوانے کا کہتی ہیں' کیا میں اسے کٹوا سکتا ہوں؟ جواب سے ضرور مطلع فرمائیں۔''

تو اس کا جواب یہ دیا گیا:

''عام طور پر اہل علم داڑھی رکھنا دینی لحاظ سے ضروری قرار دیتے ہیں' تاہم ہمارے نزدیک داڑھی رکھنے کا حکم دین میں کہیں بیان نہیں ہوا' لہٰذا دین کی رو سے داڑھی رکھنا ضروری نہیں ہے۔''(۱۶)

یہاں کہا گیا ہے کہ داڑھی کا حکم دین میں کہیں نہیں' سوال یہ ہے کہ دین کیا ہے؟

مناسب ہے کہ اس کا جواب جناب جاوید احمد غامدی کے الفاظ ہی میں دیا جائے۔ غامدی صاحب اپنی کتاب 'میزان' میں قرآن اور سنت کی تعریف کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''دین لاریب انہی دو اصولوں میں ہے۔ ان کے علاوہ کوئی چیز دین ہے' نہ اسے دین قرار دیا جا سکتا ہے۔''(۱۷)

اسی صفحہ پر اس فقرہ سے پہلے سنت سے ثابت شدہ امور کے ذکر کے بعد یہ سطور بھی موجود ہیں:

''سنت یہی ہے کہ اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے' یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے' لہٰذا اس کے بارے میں اب کسی بحث ونزاع کے بعد کوئی گنجائش نہیں ہے۔''(۱۸)

سنت کے ذریعے جو دین ہمیں ملا ہے' اس کے حوالے سے غامدی صاحب نے ستائیس امور کا ذکر کیا ہے' لیکن داڑھی ان میں شامل نہیں' حالانکہ احادیث صحیحہ کی رُو سے ایک مسلمان کے لیے داڑھی رکھنا ضروری ہے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے:

((عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ : قَصُّ الشَّارِبِ وَاِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ.....))(۱۹)

''دس خصلتیں فطرت میں سے ہیں: مونچھیں کٹوانا' داڑھی بڑھانا.....''

فتح الباری میں فطرت کے مفہوم کے حوالے سے اہل علم کی کئی آراء ذکر کی گئی ہیں جو معنی کے لحاظ سے تقریباً متفق ہیں۔ قاضی بیضاوی کے حوالے سے ابن حجر لکھتے ہیں:

وقد ردّ القاضی البیضاوی الفطرة فی حدیث الباب الی مجموع ما ورد فی معناها وهو الاختراع وا والدین والسنة فقال: هی السنة القدیمة التی اختارها الانبیاء واتفقت علیها الشرائع وکانها امر جبلی فطر علیها (۲۰)

''قاضی بیضاوی نے مذکورہ حدیث میں لفظ فطرت کو اس مفہوم کی روایات کے مجموعے کی طرف لوٹایا ہے اور وہ ہے اختراع' جبلت' دین اور سنت۔ چنانچہ فرمایا کہ یہ (فطرت) وہ سنت قدیمہ ہے جسے انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمایا اور تمام شریعتیں اس پر متفق ہیں۔ گویا یہ ایک جبلی امر ہے جس پر اصلاً لوگوں کی تخلیق ہوئی۔''

یہاں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ داڑھی 'اہل اشراق' کی تعریف سنت پر بدرجہ اتم پورا اترتی ہے۔ ان کے نزدیک سنت:

''دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔'' (۲۱)

اب دیکھئے یہاں تو صرف دین ابراہیمی کا ذکر کیا گیا جبکہ اوپر قاضی بیضاوی کے حوالے سے ذکر کیا گیا کہ فطرت سے مراد وہ چیزیں ہیں جن پر تمام انبیاء اور ان کی شرائع کا اتفاق رہا ہے۔ سنت کے حوالے سے غامدی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ہمیں قرآن کی طرح امت کے اجماع سے ملی ہے۔

اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ داڑھی کے بارے میں امام ابن حزم ''مراتب الاجماع'' میں لکھتے ہیں:

واتفقوا ان حلق جمیع اللحیة مثلة لا تجوز (۲۲)

''اُمت کے سب علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ داڑھی مونڈنا مثلہ (عیب دار کرنا) ہے اور یہ جائز نہیں''۔

اسی طرح 'موسوعة الاجماع' میں 'حلق اللحیة' کے عنوان کے تحت یہی عبارت موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ۱/۵۴۰۔ ظاہر ہے کہ جب مونڈنا جائز نہیں تو رکھنا ضروری ہوا۔

یہ امر باعث تعجب اور فہم سے بالاتر ہے کہ سنت کی شرائط (جو خود غامدی صاحب نے ذکر کی ہیں) پر پورا اترنے کے باوجود داڑھی کو آخر کس حکمت ومصلحت کے پیش نظر سنت سے خارج کر دیا گیا ہے؟

تفصیل بالا سے واضح ہوا کہ اہل 'المورد' کے اپنے اصولوں کی رو سے داڑھی دین کا حصہ قرار پاتی ہے اور اس مسئلہ میں وہ تمام اُمت کی مخالفت کے ساتھ ساتھ اپنے ہی اصول کی مخالفت کے بھی مرتکب ہوئے ہیں۔

(۹) سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی

ملتِ اسلامیہ کے وہ متفقہ امور جن سے 'اہل اشراق' نے بلا دلیل قطعی اختلاف کر کے تفرد کی راہ اختیار کی ہے انہی میں سے ایک مسئلہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے قربِ قیامت نزول کا بھی ہے۔ چنانچہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کے حوالے سے ایک سوال کے جواب میں 'اہل اشراق' کی طرف سے لکھا گیا:

''یہ قرائن اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی سے متعلق احادیث کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے اور بطور خاص قرآن مجید کے محولہ بالا مقامات سے سامنے آنے والے عقدے کو حل کیا جائے۔ جب تک ان سوالات کا قابل اطمینان جواب نہیں ملتا' اس باب میں کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں ہے۔''(۲۳)

یہاں جن قرائن کی طرف اشارہ ہے.....؟ وہ تین ہیں:

۱۔ سورۂ آل عمران میں رفع عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے لیکن آمد ثانی کا تذکرہ نہیں۔

۲۔ سورۃ المائدۃ میں روز قیامت اللہ تعالیٰ اور سیدنا عیسیٰؑ کے مابین مکالمے کا ذکر ہے لیکن آمد ثانی کی تصریح نہیں۔

۳۔ حدیث کی سب سے پہلے مرتب ہونے والی کتاب 'موطا امام مالک' میں حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی سے متعلق کوئی روایت موجود نہیں۔

گویا جس عقیدے (یا بات) کا ذکر قرآن یا موطا امام مالک میں نہ ہو اس کا معاملہ مشکوک ہو جاتا ہے' اس کے بارے میں اور کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں رہتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ بات احادیث کا بنظر غائر جائزہ لینے کے بغیر محض ٹالنے کی خاطر کہی گئی ہے' کیونکہ اہل اشراق کے نزدیک حدیث سے:

''دین میں کسی عقیدہ و عمل کا ہرگز کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔''(۲۴)

رہ گئی سنت تو:

''سنت کا تعلق تمام تر عملی زندگی سے ہے' یعنی وہ چیزیں جو کرنے کی ہیں۔ علم و عقیدہ' تاریخ' شان نزول اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''(۲۵)

باقی بچا قرآن تو اس کے بارے میں یہ تصریح کی جا چکی ہے کہ اس میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر نہیں۔ اب یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ اگر احادیث کا بنظر غائر جائزہ لے بھی لیا جائے اور ان سے نزول عیسیٰ علیہ السلام کا ثبوت مل بھی جائے تو 'اہل اشراق' اسے کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں؟ سنت سے ویسے اس کا ثبوت نہیں ہو سکتا اور نہ ہی وہ قرآن میں موجود ہے' لہٰذا اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ ان کے ہاں قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ اُمت کا اس باب میں کیا موقف ہے۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں:

قال القاضی رحمہ اللہ: نزول عیسیٰ علیہ السلام وقتلہ الدجال حق' وصحیح عند اھل السنۃ للاحادیث الصحیحۃ فی ذلک ولیس فی العقل ولا فی الشرع ما یبطلہ' فوجب اثباتہ(۲۶)

''قاضی (عیاضؒ) نے فرمایا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا اور دجال کو قتل کرنا اہل سنت کے نزدیک حق اور صحیح ہے اور عقلی اور شرعی طور پر کوئی ایسا امر نہیں جو اسے باطل قرار دے' لہٰذا اس کا اثبات لازم ٹھہرا''۔

اس امر میں اُمت کا کوئی اختلاف نہیں' کیونکہ امام نوویؒ نے اس کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔ اسی لیے اس عقیدے کا ذکر 'موسوعۃ الاجماع' میں بھی کیا گیا ہے۔(۲۷)

یاد رہے کہ نزول عیسیٰ کی روایات اہل علم کے ہاں متواتر ہیں لہٰذا ان پر ایمان واجب ہے۔(۲۸) یہاں یہ امر بھی باعث دلچسپی ہوگا کہ

نزول عیسیٰ کا انکار صرف بعض معتزلہ، جہمیہ اور ان کے ہمنواؤں نے کیا ہے۔[۲۸]

حرف آخر

مندرجہ بالا بحث سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جناب غامدی صاحب کا فکر کیا برگ و بار لا رہا ہے۔ ''اہل اشراق'' کے اُمت مسلمہ کے مسلمات سے انحراف کی فہرست میں اور بھی بہت سے امور شامل ہیں۔ بغرض اختصار چند امور بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کئے گئے ہیں جس سے فقط یہ مقصود ہے کہ غامدی مکتب فکر کے افکار و نظریات کے مضمرات اور اثرات و نتائج کا ادراک کیا جا سکے۔ 'اہل المورد' کی خدمت میں بھی بصد ادب گزارش ہے کہ ٹھنڈے دل سے ان معروضات پر غور فرمائیں اور اپنے نقطہ نظر پر نظر ثانی کریں۔ امید ہے کہ ان سطور کو لائق توجہ سمجھا جائے گا۔

﴿إِنْ أُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللهِ﴾ (جاری ہے)

☆☆

حوالہ جات:

(۱) ملاحظہ ہو غامدی صاحب کی کتاب برہان میں موجود مضمون ''رجم کی سزا''۔

(۲) صحيح مسلم، كتاب الحدود، مؤطا امام مالك، كتاب الحدود۔ وصحيح البخاری، كتاب الحدود۔

(۳) موسوعة الاجماع : (۳۲۲/۱)

(٤) بداية المجتهد : (٦٨٤/٢)

(٥) موسوعة الاجماع : ٢٨٩/١)

(٦) ايضاً

(۷) ماہنامہ اشراق: جنوری ۱۹۹۶ء، ص ۶۱

(۸) ايضاً

(۹) ماہنامہ اشراق: دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۵۴، ۵۵

(۱۰) www.urdu.understanding-islam.org

(۱۱) موسوعة الاجماع : (٨٦٥/٢)

(۱۲) ايضاً

(۱۳) www.urdu.understanding-islam.org

(١٤) موسوعة الاجماع : (١٠٥٧/٢)

(١٥) www.urdu.understanding-islam.org

(١٦) موسوعة الاجماع : (١٠٥٧/٢)

(١٧) www.urdu.understanding-islam.org

(۱۸) ميزان : جاويد احمد غامدی، ص ۱۰

(۱۹) ايضاً، ص ۱۰

(۲۰) صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة۔

(۲۱) فتح الباری: (٦١٤/٢ تا ٤١٧)

(۲۲) ميزان : جاويد احمد غامدی، ص ۱۰

(۲۳) مراتب الاجماع : ابن حزم، ص ۱۵۷۔

(٢٤) ماهنامه اشراق : جنوری ١٩٩٦ء، ص ٦١

(۲۵) میزان : جاوید احمد غامدی، ص ۱۰

(۲٦) ایضاً، ص ٦٥

(۲۷) شرح مسلم از نووی : (۲۸۷/۱۸)

(۲۸) موسوعة الاجماع : (۱۰۳٦/۲)

(۲۹) شرح عقیده طحاویه لابی العز الحنفی، ص ۵۰۱-

(۳۰) شرح مسلم از نووی: ۲۸۷/۱۸